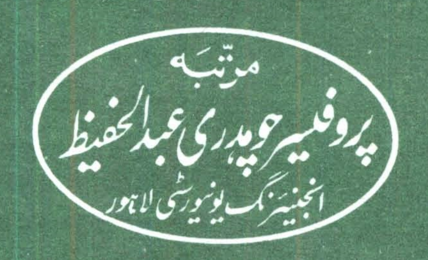
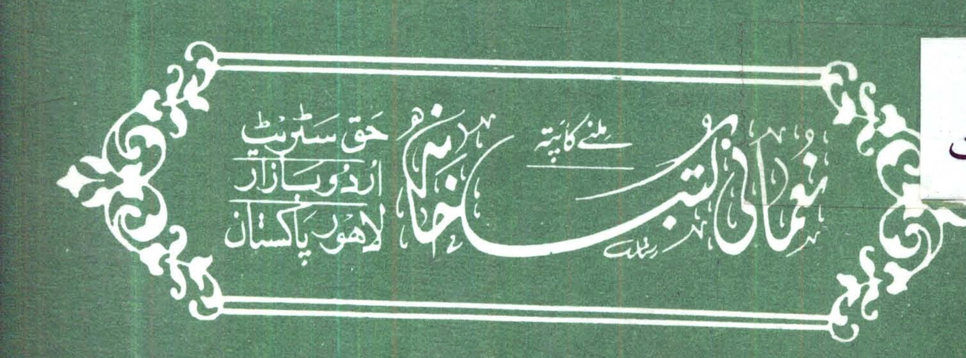
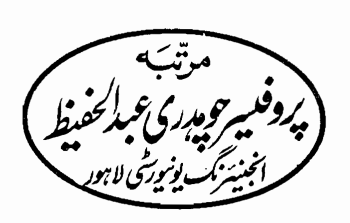
تعارف
جماعتِ مجاہدین

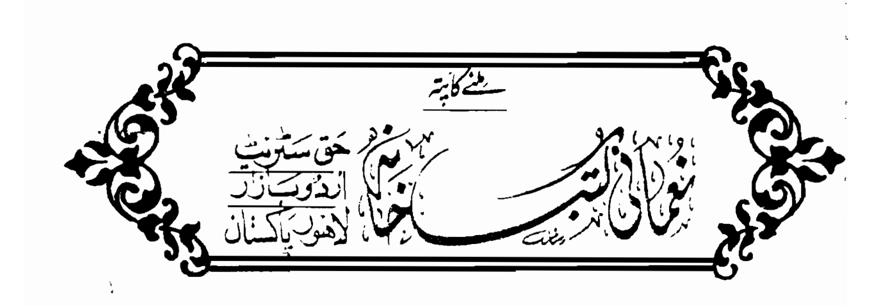




تعارف

جماعت مجاہدین





بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ مبارکہ امارت "جماعت مجاہدین"

۱۔ حضرت سید احمد شہیدؒ — ۱۲۰۱ھ - ۱۲۴۶ھ بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کیا — ۱۷۸۶ء - ۱۸۳۱ء

۔۔ مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ — ۱۱۹۳ھ - ۱۲۴۶ھ سید احمد شہیدؒ کی امارت و امامت میں — ۱۷۷۸ء - ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے

۲۔ مولانا ولی محمد پھلتیؒ شہید — ۱۸۳۱ء - ۱۸۴۰ء

۳۔ مولانا سید نصیرالدین دہلویؒ — فروری ۱۸۴۰ء - ستمبر ۱۸۴۰ء

۴۔ مولانا سید عبدالرحیمؒ شہید — ستمبر ۱۸۴۰ء - جون ۱۸۴۱ء

۵۔ مولانا عنایت علیؒ — ۱۸۴۱ء - ۱۸۴۶ء

۶۔ مولانا ولایت علیؒ — ۱۸۴۶ - ۱۸۵۲ء

۔۔ مولانا عنایت علیؒ — ۱۸۵۲ء - ۱۸۵۸ء

۷۔ مولانا نور اللہؒ — ۱۸۵۸ء - ۱۸۶۲ء

۸۔ مولانا عبداللہؒ — ۱۸۶۲ء - ۱۹۰۲ء

۹۔ مولانا عبدالکریمؒ — ۱۹۰۲ء - ۱۹۱۵ء

۱۰۔ مولانا نعمت اللہؒ شہید — ۱۹۱۵ء - ۱۹۲۱ء

۱۱۔ مولانا رحمت اللہؒ شہید — ۱۹۲۱ء - ۱۹۲۱ء

۱۲۔ مولانا فضل الٰہیؒ — ۱۹۲۱ء - ۱۹۲۸ء -

۱۳۔ مولانا محمد بشیرؒ شہید — ۱۹۲۸ء - ۱۹۳۴ء

۔۔ مولانا فضل الٰہیؒ — ۱۹۳۴ء - ۱۹۵۱ء

۱۴۔ مولانا صوفی عبداللہ — ۱۹۵۱ء - ۱۹۷۵ء

۱۵۔ مولانا محمد سلیمانؒ — ۱۹۷۵ء - ۱۹۸۳ء

۱۶۔ حضرت قاضی عبدالکریم خاں حفظہ اللہ — ۱۹۸۳ء -

ناشر : جماعت مجاہدین پاکستان
۹۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور
تعداد اشاعت : ایک ہزار
مطبع : ایور گرین پریس لاہور
ملنے کا پتہ : ○ دفتر جماعت مجاہدین پاکستان
۹۔ شارع فاطمہ جناح لاہور
○ نعمانی کتب خانہ، حق سٹریٹ
اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

" جماعت مجاہدین " تعارف کی محتاج نہیں ۔ بہت موٹی اور بڑی بڑی کتابیں جماعت کے کارناموں پر لکھی جا چکی ہیں لیکن اتنی موٹی موٹی اور بڑی بڑی کتابوں کے باوجود یہ موضوع ھنوز تشنہ ہے ۔ تحقیق و تدقیق کا میدان اب بھی کسی ریسرچ سکالر کی راہ دیکھ رہا ہے ۔ مولانا فضل الٰہیؒ کے اہل و عیال کے پاس اب بھی بے بہا تحریری مواد اور خزینہ موجود ہے جسے آج تک کسی نے چھوا نہیں ۔ مولانا غلام رسول مہرؒ کو یہ تمنا رہی کہ کسی وقت مولانا فضل الٰہیؒ کو سکون کے لمحات میسر ہوں تو وہ انکے پاس اس دولت گرانمایہ کا مطالعہ و مشاہدہ کر سکیں ۔

ع ۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ۔۔۔ مولانا فضل الٰہیؒ اللہ کو پیارے ہو گئے اور آج مولانا غلام رسول مہرؒ بھی ہم میں موجود نہیں ۔

ان آرزوؤں میں یہ چھوٹا سا کتابچہ نہ تو تحقیق کی دنیا میں کسی اضافے کا باعث ہو گا اور نہ " جماعت مجاہدین " کے کارناموں کی کوئی بھرپور داستاں کا درجہ رکھتا ہے ۔ البتہ عوام الناس اور وہ احباب جن کے ذہنوں میں ایک سوالیہ نشان رہتا ہے کہ جماعت مجاہدین کیا ہے ؟ اس کا تعارف کیا ہے ؟ انکی تشفی کا شاید کچھ ساماں ہو سکے ۔ ان سوالات کا سبب یہ ہے کہ نہ عوام الناس کے ہاں اور نہ احباب کے پاس اس قدر وقت ہے کہ وہ ان موٹی موٹی تحقیقی کتابوں کا مطالعہ کر سکیں ۔۔۔ کیونکہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں " وقت " عنقا ہو گیا ہے ۔ " فرصت " نام کی کوئی چیز میسر نہیں ' شوق مطالعہ اور ذوق مشاہدہ ' کو گردش دوراں کی ستم ظریفی نے چاٹ لیا ہے ' اس لئے بڑی بڑی کتابیں پڑھنے اور علمی شہ پاروں کی ورق گردانی سے ہم بے نیاز ہو چکے ہیں ۔ اس دور کا تقاضا

ہے کہ جامع اور مختصر خلاصہ یا نچوڑ ہو جسے ایک آدھ گھنٹہ میں انسان پڑھ کر ہضم کر سکے۔ بس اسی نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے' جماعت مجاہدین' پاکستان کے حکم کے مطابق ایک حقیر سی سعی کی ہے' اللہ کرے احباب کے معیار پر پوری اتر سکے۔ (آمین)

اس "کتابچہ" سے متعلق صرف ایک بات کہنا لازمی ہے کہ بندۂ عاجز کی کوشش یہ رہی ہے کہ اپنی طرف سے کم سے کم بات ہو۔ چونکہ "جماعت مجاہدین" سے متعلق بہت وسیع مواد کتابوں میں موجود ہے اس لئے بغیر کسی بخل کے مؤلفین و مصنّفین کی عبارات' اقتباسات اور آراء دور حاضر کی معروف اصطلاح میں "قوموں" میں نقل کر دی گئی ہیں۔ ان کا حوالہ بھی باقاعدہ حاشیہ پر دے دیا گیا ہے۔ ماخذ کی فہرست آخر میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتابچہ نہ تو بندۂ عاجز کی تصنیف ہے نہ تالیف۔ صرف اور صرف "جماعت مجاہدین" کا یہ تعارف حتی المقدور نئی ترتیب اور نئے عنوانوں کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت بندۂ عاجز کو حاصل ہو رہی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر گزار ہوں کہ شاید ہم اسلاف کے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کرنے کے قابل ہو سکیں۔ آمین

عبدالحفیظ عفی عنہ
شعبہ علوم اسلامیہ
انجینئرنگ یونیورسٹی' لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف جماعت مجاہدین

O ـــ قرآنی نقطہ نظر سے جماعت مجاہدین کا مختصر تعارف کچھ اس طرح ہے :۔

(i) " ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ و لما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء و الضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول و الذین امنوا معہ متی نصر اللہ؟ الا ان نصر اللہ قریب " ا۔

" کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں پہلے لوگوں (اسلاف) کی سی مشکلات تو پیش آئی ہی نہیں ۔ ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ (صعوبتوں میں) بری طرح ہلائے گئے ۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن جو ان کے ساتھ تھے سب پکار اٹھے اللہ کی مدد کب آئے گی "؟ اچھی طرح جان لو اللہ کی مدد قریب ہے ۔ "

(ii) من المومنین رجال صدقوا ما عھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا " ۲۔

(اہل ایمان میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جس بات کا عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا ۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی نذر (شہادت) سے فارغ ہو گئے اور کچھ وہ ہیں جو شوق شہادت سے سرشار ہیں اور انہوں نے (اپنے عہد میں) ذرا سا بھی ردوبدل نہیں کیا ۔)

O ـــ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں جماعت کا جو کردار سامنے آتا ہے وہ اس طرح ہے :۔

(i) " ابو عمرو سفیان بن عبداللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی ! اللہ کے رسولؐ ! مجھے اسلام کے بارے میں ایک کلمہ ایسا بتا دیجئے کہ آپ کے علاوہ پھر کسی غیر سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے ۔ آپؐ نے فرمایا ۔ " **قل امنت باللہ ثم استقم** " (

ا ۔ سورۃ البقرۃ : ۲۱۴ ۲ ۔ الاحزاب : ۲۳

مسلم شریف)(تو کہہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہ")

سارے دین اسلام کا خلاصہ اور نچوڑ ان دو لفظوں میں سمو دیا کہ اسلام لانے کے بعد اگر آسمان و زمین پھٹ پڑیں' یہ دنیا تہس نہس ہو جائے' انسان پر پے بہ پے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں' اسے راہ حق میں سر پر آرا رکھ کر چیر دیا جائے' اسے تیل کے کڑاہوں میں مچھلی کی طرح تل دیا جائے' اسے آتش نمرود میں خلیل اللہ کی طرح بھسم کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کی بوٹیاں کر کے جانوروں اور درندوں کے سامنے پھینک دی جائیں تو پھر بھی وہ اسلام سے اپنا رشتہ نہ توڑے' بلکہ اسلام کی خاطر تن' من' دھن کی قربانی دیتے ہوئے ہر بن مو سے یہ صدا آئے:۔

؎ جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

"---تو فنی مسلما و الحقنی بالصالحین" (یوسف:۱۰۱) (یا اللہ مجھے تیری اطاعت میں موت نصیب ہو اور مجھے صالحین سے ملا دے)

یا حضرت خبیبؓ کی طرح سولی کی طرف دیوانہ وار لپکتے ہوئے اس کے لبوں پر محبت کا یہ ترانہ ہو:۔

؎ فلست بمبد للعدو تخشعا
ولا جزعا الی اللہ مرجعی
؎ فو اللہ ما ارجوت اذا مت مسلما
الی ای جنب کان فی اللہ مصرعی
؎ و ذالک فی ذات الالہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع

میں دشمن کے ظلم و استبداد کے سامنے ہرگز جھکنے والا نہیں ہوں' نہ جزع اور فزع کروں گا اس لئے کہ میں اللہ کی طرف لوٹ رہا ہوں پس خدا کی قسم جب مجھے یہ یقین ہے کہ میں اسلام پر جان دے رہا ہوں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں میں

کس پہلو پر گرتا ہوں اور کیونکر جان دیتا ہوں' اللہ سے مجھے یہ امید ہے کہ اگر وہ چاہے تو میرے ہر پارۂ گوشت کو برکت عطا فرمائے۔ جماعت مجاہدین کے اخلاق و کردار کا نقشہ ایک دوسری حدیث نبوی میں اس طرح آیا ہے:۔

حضرت عبداللہ بن خباب بن ارت سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اذیتوں کی شکایت کی اور عرض کیا کیا آپ اللہ سے ہمارے لئے مدد کی دعا نہیں فرمائیں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا:۔

" قد کان من قبلکم یو خذ الرجل فیحفر لہ فی الارض فیجعل فیھا ثم یو تی با لمنشار فیو ضع علی راءسہ فیجعل نصفین و یمشط بامشاط الحدید ما دون لحمہ و عظمہ ما یصدہ ذلک عن دینہ" (بخاری)

تم سے پہلے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں کہ ایک آدمی کو پکڑ کر زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیا جاتا تھا پھر آرے سے اس کو دو حصوں میں چیر دیا جاتا تھا' لوہے کی کنگھیوں سے اس کے گوشت کو اس کی ہڈیوں سے جدا کر دیا جاتا تھا لیکن ایسا عذاب بھی اسے اس کے دین سے منحرف نہیں کر سکتا تھا

--- **" باللیل رھبانا و بالنھار فرسانا"** (رات کو عبادت گزار اور دن کو شہسوار) --- کی بات بھی " جماعت مجاہدین " کے جانثاروں کی زندگیوں پر صادق آتی ہے۔

زبان شعر میں اگر جماعت مجاہدین کا مختصر اور جامع تعارف مقصود ہو تو مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ" کا یہ شعر کافی ہے:۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تفصیلی تعارف مقصود ہو تو نظریں " سید بادشاہ کا قافلہ " کے صفحہ ۹ پر جا اٹکتی ہیں۔ آباد شاہ پوری نے کیا خوب لکھا ہے:

O --- یہ ایک عظیم تحریک کے قافلہ شوق کی داستان جلیل و جمیل

O --- برصغیر پاکستان و ہند کی پہلی اسلامی تحریک کے قافلے کی داستان لازوال

O --- ان روح پرور دینی ولولوں اور کفر و باطل کے ساتھ جا نگسل تصادموں اور رنج و

محن کی داستان جا نگداز ۔۔۔ جس کے اوراق بالا کوٹ کی شہادت گاہ سے اندرون ملک کے قید خانوں اور انڈمان کے وحشتناک جزیروں تک پھیلے ہوئے ہیں ۔

O ۔۔۔ تقریباً سوا سو برس کے عرصے پر محیط ایک ایسی داستان جس کو جنم دینے والا ایک ایک لمحہ ایمان افروز اور جذب و شوق کی کائنات لئے ہوئے ہے ۔ "ا ۔

O ۔۔۔ " اللہ کے پیانہ کامیابی و ناکامی میں یہ تحریک ایک کامیاب ترین تحریک تھی ۔ اس کے کارکنوں نے کتاب و سنت کی خالص تعلیمات کو پھیلانے اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی بے لوث جدوجہد کی ۔ اپنے گھربار ' اہل و عیال ' برادری ' پھلتے پھولتے کاروبار ' شاندار کیریئر ' راحت و آرام اور دنیا کے مفادات اور اس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کو تج کر غربت و مہاجرت کی زندگی اختیار کی ' مصیبتیں اور سختیاں سہیں ' ایک بار اللہ سے جو عہد باندھا اس سے مونہہ نہ موڑا ' اپنی زندگیاں حق کی راہ میں وقف کر دیں اور جانوں کی قربانی دے کر اخلاص و للہیت ' حسن کردار و عمل اور صدق وفا کا ایک ایسا باب رقم کیا جس کی تابانیوں سے آج بھی اس راہ کے راہرو فیضان حاصل کر سکتے ہیں " ۲ ۔

O ۔۔۔ سیرت سید احمد شہید " کا مصنف جماعت مجاہدین کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے :

" .... سید صاحب " کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالئے اور وہ یہ کہ آپ نے تھوڑے زمانے میں ایک دینی فضا قائم کر دی اور ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہ کا نمونہ تھے ۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے ' اللہ کے لئے جان دینے والے ' شریعت پر جینے اور مرنے والے ' بدعت سے نفور ' شرک کے دشمن ' جہاد کے نشے میں سرشار ' متقی و عبادت گزار ' اور بڑی بات یہ ہے کہ ہم رنگ و یک آہنگ ۔ تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہؓ و تابعین " کے بعد مشکل سے ملے گی ۔ کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں ' لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی ' نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیانے پر عزم و توکل ' جوش جہاد ' ایمان و

ا ۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۹ ' ۲ ۔ ایضاً صفحہ ۱۱

احتساب ' شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری اور مردم سازی ' اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

ان آخری صدیوں میں ہم کو دنیائے اسلام میں کسی ایسی مذہبی تحریک کا علم نہیں ہوا ' جو ہندوستان کی اس " تحریک احیائے سنت و جہاد " سے زیادہ منظم و وسیع ہو اور جس کے سیاسی اور مذہبی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوں۔ ہندوستان کی کوئی اصلاحی جدوجہد اور مسلمانوں کی کوئی سیاسی تحریک ایسی نہیں جو اس تحریک سے متاثر نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برصغیر میں موجودہ اسلامی زندگی ' مذہبی اصلاح ' مسلمانوں کی سیاسی بیداری ' اور ملک میں مسلمانوں کے وجود کی اہمیت اور ان کا سیاسی وزن بڑی حد تک اسی طویل جہاد کا رہین منت ہے "[1]

سید ابو الحسن علی ندوی حفظہ اللہ نے دوسری جگہ جماعت مجاہدین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے لکھتے ہیں:

" سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) نے جو مبارک جماعت تیار کی ' خصوصیات میں سب سے نمایاں اور لائق ذکر بات اس کی جامعیت ہے۔ اس میں جہاد اصغر (تزکیہ نفس) بھی تھا اور جہاد اکبر (جہاد و قتال) بھی ' اللہ سے محبت بھی ' اللہ کا خوف بھی ' اللہ کے لئے محبت بھی ' اللہ کے لئے نفرت بھی ' زہد و عبادت بھی اور دینی حمیت اور اسلامی غیرت بھی ' تلوار بھی اور قرآن بھی ' عقل بھی اور جذبات بھی ' گوشہ مسجد میں تسبیح و مناجات بھی ' اور گھوڑے کی پیٹھ پر " تکبیر مسلسل " بھی ' یہ وہ صفات و کمالات ہیں جو اکثر سوانح نگاروں کی نظر میں ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم نظر آتے ہیں ' لیکن یہ سب درحقیقت اس صحیح دینی فہم اور دینی شعور کا کرشمہ تھا ' جو سید صاحبؒ کی شخصیت اور صحیح تربیت کی وجہ سے جماعت مجاہدین میں پختہ اور راسخ ہو چکا تھا اور زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی تھا ' اس کا دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ دینی جماعت یا تحریک دینی تربیت کے اہم مرحلہ سے سرسری طور پر نہیں گزری تھی اور بغیر تیاری کے اس نے کارزار حیات میں قدم نہیں رکھا تھا ' اس نے ان معاملات میں بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ہاتھ ڈالا تھا

1۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۴۲-۴۱ (مولانا ابو الحسن علی ندوی)

اور اس کے لئے وہی راستے اختیار کئے تھے جو منزل مقصود تک لے جاتے ہیں۔ یہ ایک صاحب یقین اور مجاہد نسل کی بہترین تصویر اور اخلاص و للہیت کا وہ صحیح معیار اور دلکش نمونہ ہے جو ہر زمانہ میں مطلوب اور شریعت کا مقصود ہے۔"[1]

مولانا مودودی صاحب" نے اس جماعت کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ترکتازیوں کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے آخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور تیرھویں صدی تک جاری رہا۔ لیکن چند غیر معروف مستثنیات کی گنجائش رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی جہاد اس سرزمین پر صرف ایک ہی مرتبہ ہوا تھا اور یہ وہی جہاد تھا جس کے امیر حضرت سید احمد" بریلوی اور سپہ سالار حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ پہلی لڑائیاں نہ تو خالصتہ للہ تھیں نہ ان کی تہہ میں خالص اسلامی سیرت تھی۔ نہ ان میں اسلامی قوانین جنگ کی پوری پابندی کی گئی اور نہ ان کے نتیجے میں خلافت الٰیہ کبھی یہاں قائم ہوئی اس لئے وہ بس لڑائیاں تھیں، جہاد فی سبیل اللہ نہ تھیں۔ لیکن پوری بارہ سو سال کی تاریخ میں یہ "اللہ کے بندے ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے تمام نفسانی، قومی اور ملکی اغراض سے اور تمام جاہلی تعصبات اور خواہشات سے پاک ہو کر صرف اس لئے جنگ کی کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری ہو۔ فاسقین و فجار کی جگہ صرف صالحین کی فوج مرتب کی۔ جنگ و صلح دونوں حالتوں میں شریعت کے قوانین سے ذرہ برابر تجاوز نہ کیا اور جہاں ان کو حکمرانی کا موقع ملا وہاں بالکل خلفائے راشدین کے طرز کی حکومت کی۔ دنیوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا واقعہ پچھلی عظیم الشان فتوحات اور سلطنتوں کے مقابلے میں اتنا حقیر نظر آتا ہے گویا پہاڑ کے سامنے ایک رائی کا دانہ ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس ملک میں اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ سب سے زیادہ درخشاں ہے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا کی میزان میں ہندی مسلم قوم کے دوازدہ صد سالہ کارنامے میں جتنا حصہ خیر کے پلڑے میں رکھے جانے کے قابل ہو گا اس کا سب سے زیادہ وزنی جزو یہی ہو گا"[2]۔

۱۔ جب "ایمان کی بہار آئی" مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صفحہ ۷۔۶ ، ۲۔ مقالات شاہ اسمٰعیل شہید

پس منظر

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس جماعت کی ضرورت کیا تھی؟ اس کے مقاصد، اس کی غرض و غایت کیا تھی؟ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ جب بھی کسی قوم میں زوال اور پستی کی انتہا ہوتی ہے تو یا دست فطرت اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے یا اس میں ایسے "مصلح" یا "مصلحین" کو پیدا کرتا ہے جو اس قوم کے احیاء کے ضامن بن جاتے ہیں۔ امت مطہرہ کیلئے تو خود نبی اکرمؐ کا فرمان ہے کہ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد پیدا ہو گا جو اسے راہ راست پر لائے گا:۔

عن ابی ھریرۃؓ فیما اعلم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال ان اللہ یبعث لھذہ الامتہ علی راس کل مائتہ سنہ من یجدد لھا دینھا" [1]

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ امت مطہرہ کیلئے ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد بھیجے گا۔ جو اس کے دین کے احیاء کا باعث ہو گا۔

ان حالات میں جب ہماری نظریں، برصغیر کے مسلمانوں کی طرف اٹھتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے انگریز کی دو صد سالہ غلامی نے انہیں قعر مذلت میں دھکیل دیا ہے۔ ان کا نہ اپنا مذہب باقی ہے، نہ ان کی اپنی تہذیب و ثقافت۔ رسوم و رواج پر اگر ہندوؤں کی چھاپ ہے تو تہذیب و ثقافت پر مغربی تہذیب کا غلبہ۔ علامہ اقبالؒ نے صحیح کہا تھا:۔

؎ دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
چارہ کوئی ڈھونڈ ان کی پریشاں نظری کا

اس پس منظر کو جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے جماعت مجاہدین کے صحیح کردار کی عکاسی ہو گی اور اس کے کارناموں کا صحیح ادراک نصیب ہو گا۔

تیرھویں صدی میں ہندوستان کی حالت

سیاسی حالت:

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

---

[1] ابو داؤد ۲/۴ (کتاب الملاحم)

"تیرھویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل) میں ہندوستان، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے زوال کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ مدت ہوئی بکھر چکا تھا۔ سارے ہندوستان پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تھا یا اس کے معتمدین اور حلیفوں کا۔ بچا کھچا ملک ان قسمت آزما رئیسوں اور سرداروں کے قبضے میں تھا جو یکے بعد دیگرے شکست کھاتے اور ملک حوالے کرتے چلے جا رہے تھے۔ شاہ عالم جن کے عہد میں سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے اور جوان ہوئے، صرف نام کے شاہ ہندوستان تھے۔ سید صاحبؒ کی ولادت سے بائیس سال قبل ہی ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵ء) میں بنگال، بہار، اڑیسہ، تینوں صوبوں کی دیوانی بلا شرکت غیرے بطور "التمغا" (انعامی یا عطا شدہ جاگیر کی سند) سرکار کمپنی کو دی جا چکی تھی۔ سرکار بنارس اور "غازی پور" بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے۔ اب خاندان تیموریہ کے بادشاہ (شاہ عالم) کے پاس ملک میں صرف صوبہ الہ آباد تھا اور آمدنی میں وہ روپیہ تھا جو انگریز اس کو دیتے تھے۔

۱۸۷ھ (۱۲۰۳ء) میں جب سیّدؒ صاحب دو سال کے تھے کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر اور ذلیل ہو گئی ہے ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں"۔۔۔ اس کے اگلے ہی سال ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال دیں اور اس انسان کو جو تیموری سلطنت کی شان و شوکت کا نشان اور شاہجہان اورنگ زیب کا جانشین تھا، سخت ذلیل کیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اپنی انگریزی فوج لے کر دلی داخل ہوا، مرہٹوں کو وہاں سے نکالا اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دی۔ شاہ عالم اور ان کے جانشین اکبر شاہ نے اپنی بقیہ زندگی ایک ایسے وظیفہ خوار رئیس کی حیثیت سے گزاری جس کا ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہ تھا اور جس کے اختیارات قلعہ معلی تک محدود تھے۔

"زوال سلطنت" کہنے کو تو دو لفظ ہیں۔ لیکن یہ کسی قوم اور ملک کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں۔ سلطنت کو کمزور پا کر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دکن سے لے کر دہلی تک کا ملک اور جو کچھ ملک میں تھا مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ پنجاب سے لے کر افغانستان کی حدود تک سکھوں کا راج تھا، جن کی تاخت اور دست برد سے ہندوستان کا

شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ دہلی اور اطراف دہلی مرہٹوں اور سکھوں کی غارتگری کا نشانہ بنے رہتے تھے اور یہ سب جب چاہتے تھے یا جب ان کو موقع ملتا تھا اس آباد اور مرکزی علاقے کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتے۔ مال و املاک کو لوٹتے' اور شہری شرفاء و معززین کو بے عزت کرتے چلے جاتے۔ شہروں کی زندگی میں تھوڑے تھوڑے وقفے بعد یہ مدوجزر آتے رہتے اور کوئی سکون کے ساتھ زندگی نہ گزار سکتا۔ اس قسم کا جو سیلاب بھی آتا' وہ دہلی کے سر پر سے ضرور گزرتا۔ اس لئے وہاں سب سے زیادہ انتشار رہتا۔ مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کے حملے کے وقت شہر کے پرامن باشندے اور شرفاء قصبات اور دیہات کی طرف منتقل ہو جاتے۔ حملہ آوروں اور غارتگروں کے سیلاب نکل جانے کے بعد پھر واپس آجاتے۔

بارھویں صدی ہجری کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک یہی کیفیت تھی۔ اس زمانے کے خطوط سے اس بدامنی' انتشار اور طوائف الملوکی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سید شاہ ابو سعیدؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہ حالت بھی عجیب حالت ہے۔ کافر سکھوں' مرہٹوں اور جاٹوں کے مسلمانوں کے شہروں پر غلبہ پانے' ان کے مال کو لوٹنے اور ان کو بے عزت و بے آبرو کرتے رہنے کی وجہ سے آرام و آسائش خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ چنانچہ فقیر اپنے متعلقین کے ساتھ مراد آباد منتقل ہو گیا ہے اور دو آبے کا سارا علاقہ ان مفسدوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہو رہا ہے"[1]

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند" (ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے)[2]

دارالسلطنت کی بدامنی اور اہل شہر کی پریشان حالی کا تذکرہ کرتے ہیں:۔

"احوال مردم شہر از بیماری عام و ناایمنی تا کجا نو یسند' خدا ازیں بلدۂ مورد غضب الٰہی برآرد کہ نسقے در امور سلطنت نماندہ' خیراخیر کند"[3] (عام بیماری' بدامنی اور اہل شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے؟ اللہ اس شہر سے جو مورد غضب الٰہی بن رہا ہے نجات دے' امور سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا۔ خدا اپنا فضل کرے)

۱۔ مآثر الابرار (فارسی)' ۲۔ کلمات طیبات مکتوب ۴۰ ۳۔ کلمات طیبات۔ مکتوب ۸۶

؎ دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ہندوستان کے اصلی سیاسی شاطر انگریز تھے ' جو اس بساط شطرنج پر مہروں کو لڑاتے اور آگے بڑھاتے اور پیچھے ہٹاتے رہتے تھے۔ ان کے مقابلے میں آخری منظم کوشش سلطان شہید سلطان ٹیپو ؒ نے ۱۷۹۹ء میں کی تھی ' جو ناکام رہی۔ کمپنی کے اس دور تجارت و سیاست میں ملک کی جو سیاسی و اخلاقی حالت تھی اور اسلامی سیاست کے مرکزوں میں اس نے جو رقابت اور تفرقہ پیدا کر دیا تھا ' اس کا اندازہ شاہ عبدالعزیز ؒ کے عربی قصیدے کے ایک شعر سے ہوتا ہے :۔

وانی اری الافرنج اصحاب ثروہ
لقد افسدوا مابین دھلی و کابل

(فرنگی سرمایہ داروں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے)

ڈاکٹر لوتھراپ سٹوڈرڈ (Lothrop Stodoard) مشہور امریکی مصنف نے اپنی کتاب "جدید دنیائے اسلام"
(New World of Islam) میں اس دور کی سیاسی و مذہبی و اخلاقی تصویر کھینچی ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنے حواشی میں بالکل سچ لکھا ہے کہ اگر کوئی باریک بین مسلمان حکیم و فلسفی اور اسلام کے اجتماعی امراض سے پورے طور پر باخبر مورخ بھی ان پچھلی صدیوں کی تصویر کھینچنا چاہے تو اس سے زیادہ صحیح ' مطابق اور بلیغ تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ڈاکٹر سٹوڈرڈ لکھتا ہے :۔

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی ' صحیح قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے۔ ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھا ' آداب و اخلاق قابل نفرت تھے۔ عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ مذلت میں زندگی بسر کرتے تھے۔

تعلیم مردہ ہو گئی تھی اور چند درس گاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں ' وہ افلاس اور غربت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں۔ سلطنتیں مطلق العنان تھیں اور ان میں بد نظمی

اور خون ریزی کا دور دورہ تھا ۔ جگہ جگہ کوئی خود مختار جیسے سلطان ترکی یا ہند کے شاہان مغلیہ کچھ شاہی شان قائم کئے ہوئے تھے اگرچہ صوبہ جات کے امراء اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں ' قائم کر کے بہت خوش تھے ۔ اسی طرح امراء متواتر سرکش ' مقامی رئیسوں اور ڈاکوؤں کی جماعت کے خلاف جو ملک کو آزار پہنچاتے تھے ' بر سر پیکار تھے ۔ اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی ۔ دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے لہٰذا تجارت اور زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سد رمق کے لئے کی جاتی تھیں ۔

مذہبی حالت

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا ۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خاص اسلامی توحید کو ڈھانپ لیا تھا ۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں ۔ عوام جہال ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ 'گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقراء اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے ۔ بزرگوں کے مزاروں پر زیارات کیلئے جاتے اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع و ولی کے طور پر کی جاتی تھی کیونکہ ان جہال کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلاواسطہ نہیں ادا کر سکتے ۔ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی ۔ افیون و شراب خوری عام ہو رہی تھی ۔ زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کئے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ مقامات مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ افعال قبیحہ کے قعر مذلت بن گئے تھے اور حج جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض میں تعلیم کیا تھا ' بدعات کی وجہ سے حقیر بن گیا تھا ' فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا ۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بے زاری کا اظہار فرماتے ۔"

"بد قسمتی سے ہندوستان میں اسلام ایران افغانستان کا چکر کاٹ کر پہنچا اور راستے میں اپنی بہت سی تازگی اور زندگی کھو کر ۔ یہاں کا اسلام سیکنڈ ہینڈ تھا ۔ ترک و مغل

(ترجمہ جمیل الدین صاحب بدایونی علیگ)[1]

فاتحین اسلام کے اسلام میں کوئی شک نہیں۔ لیکن مذاہب و تہذیب فتح کرنے کیلئے اتنی روحانی قوت کافی نہیں جتنی ان میں تھی۔ وہ خود اس درجے میں تھے کہ ان کی دینی تربیت کی جاتی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ خود ان کی خاص تہذیب و معاشرت تھی جو ان کے ساتھ جاتی تھی۔ ان کا مستقل نظام سلطنت تھا اور وہ مبلغ و داعی سے زیادہ حکمراں و کشور کشا تھے۔ پھر جس ملک میں وہ داخل ہو رہے تھے' اس کا خود ایک مذہب' ایک تصوف اور ایک تہذیب تھی۔ جس وقت حریفوں کی تلواریں باہم میدان جنگ میں دست و گریباں ہوئیں اس وقت ان کی تہذیبیں استفادہ و تعارف میں مشغول ہوتی تھیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ڈاکٹر یہاں اسلام ہندوستان میں جتنا اثر انداز ہوا اس سے زیادہ متاثر ہوا اور تھوڑے دنوں میں ایک بین الاقوامی اور بین المذاہب عربی' ایرانی' افغانی اور ہندوستانی مذہب و تہذیب پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں کے اسلام میں وہ ساری کمزوریاں تھیں جو ایران و افغانستان کے اسلام میں تھیں اور وہ بھی جو ہندو مذہب و تہذیب و تصوف کے اختلاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ جو لوگ یہاں اپنے پرانے مذہب سے اسلام میں داخل ہوئے۔ وہ طبعا اپنے ساتھ بہت سی مذہبی اور قومی خصوصیات' عقائد و خیالات لائے جو قائم رہے اور بعد میں مذہب میں داخل ہو گئے۔ بیوہ کا نکاح ثانی دنیا جہان میں کہیں عیب نہیں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ جرم گردن زدنی تھا۔

اس زہر کا تریاق اور اسلام کی شکل محفوظ رکھنے کے لئے دنیا میں دو چیزیں ہیں۔ قرآن و حدیث۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے یا تو عربی زبان کی ضرورت ہے یا ترجمے کی۔ عربی زبان تو ہندوستان میں مدارس سے باہر کبھی تھی ہی نہیں اور ترجمے کا یہ حال ہے کہ مشہور ہے ' شاہ ولی اللہ صاحب ؒ نے ہندوستان میں سب سے پہلے اس کا فارسی ترجمہ کیا جس پر علماء میں قیامت برپا ہو گئی کہ عوام قرآن پڑھیں گے اور گمراہ ہوں گے۔ رہی حدیث ' سو اس کے متعلق تسلیم ہے کہ گجرات اور چند ساحلی مقامات چھوڑ کر ہندوستان میں حدیث شیخ عبدالحق ؒ محدث لائے۔ یعنی گیارھویں صدی تک ہندوستان میں حدیث نہیں آئی تھی اور آنے کے بعد بھی شاہ ولی اللہ صاحب ؒ اور ان کے جانشینوں سے پہلے حدیث کا سکہ ہندوستان میں چلا نہیں تھا۔

بعض ادوار حکومت میں مذہب حکومت وقت کی سرپرستی اور حمایت سے قطعاً محروم رہا بلکہ اس کی مخالفت کی گئی اور بادشاہ اسلام نے اس کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ عہد اکبری کے متعلق ان الفاظ میں شہادت دیتے ہیں:۔

"ایک صدی میں اسلام کی غربت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ اہل کفر اس پر راضی نہیں ہیں کہ محض کفر کے احکام کا علانیہ اسلامی بلاد میں اجراء ہو جائے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ مٹا دیے جائیں اور مسلمانوں اور اسلام کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار کرتا ہے تو قتل کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں برملا اور غلبے کے ساتھ کفر کے احکام دارالاسلام میں جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے عاجز تھے اور اگر کر بیٹھتے تو قتل کر دیئے جاتے۔ "واویلاہ' واحزناہ" وا مصیبتاہ" محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رب العالمین ہیں۔ آپ کی تصدیق کرنے والے ذلیل و خوار تھے اور آپؐ کا انکار کرنے والوں کی عزت ہوتی تھی۔ انہیں کا اعتبار تھا۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی تعزیت میں مشغول اور کفار ان کا مذاق اڑا کر ان کے زخموں پر نمک چھڑکاتے تھے۔ آفتاب ہدایت گمراہی کے پردے میں چھپ گیا تھا اور حق کا نور باطل کے حجابوں میں سمٹ گیا تھا"۔ا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ دو شخصیتوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا تو یوں تو اللہ اپنے دین کا نگہبان ہے' اس کی حفاظت دین کے طریقے ہزار ہیں۔ لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا' جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہستیاں ہندوستان کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تھے۔ احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبان رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور درویشوں کے ساتھ ایک "دنیا دار" بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کا نام بھی زبان پر آتا ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء (۶۲:۴)

ا۔ مکتوبات مجدد الف ثانی نمبر ۴۶ صفحہ ۲۵ ج ا

ٹ

" تیرھویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کو جو مذہبی حالت تھی اس کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچتے ہیں۔ اگر شرک و بت پرستی دنیا میں کوئی چیز ہے اور لغت اور عرف و شرع میں اس کے کچھ معنی ہیں تو وہ صاف صاف مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی۔ قبروں اور مردوں سے متعلق ایک مستقل شریعت بن گئی تھی۔ جس کے واجبات اور مستحبات میں انہیں سجدہ کرنا' ان سے دعا مانگنا' بوسہ دینا' نذریں دینا' چادریں چڑھانا' منتیں ماننا' قربانیاں کرنا' طواف کرنا' گانا بجانا' میلہ لگانا' تہوار منانا' چراغاں کرنا' عورتوں کا جمع ہونا اور مختصراور صحیح الفاظ میں ان کو قبلہ و کعبہ اور ملجاء ماویٰ سمجھنا تھا۔ اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے متعلق وہ سب عقائد و خیالات موجود تھے جن کی وجہ سے نصرانی' یہودی اور مشرکین عرب بدنام ہیں۔ ہندوؤں اور شیعوں کی تمام رسوم مسلمانوں کی معاشرت کا جزو بن گئی تھیں اور ان سے کوئی گھر خالی نہ تھا۔ ان کی پابندی قرآن و حدیث و اسلامی فرائض سے زیادہ کی جاتی تھی۔ شرک و بدعت اور اسراف و جہالت ان کے اجزائے ترکیبی تھے۔

سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے۔ بدعت کی تعریف ہی کسی فعل پر صادق نہیں آتی تھی اور ہر بدعت "بدعت حسنہ" تھی' بہت سے حرام حلال ہو گئے تھے اور بہت سے حلال حرام۔ اسلامی شعائر اٹھ رہے تھے اور ان کی جگہ ہندوانہ شعائر لے رہے تھے اور لے چکے تھے۔ قرآن و حدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے تھے' مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفائے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب و فرض سے حرام و متروک ہو گئے تھے ہر مسلمان کو شریعت میں ترمیم اور مستقل تشریع (قانون سازی) کا حق تھا اور جس کو عام مسلمان اچھا سمجھ لیں وہ تو مستند شریعت تھی۔ قرآن ایک معمہ تھا' جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اور نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کا بہت سا حصہ منسوخ ہو کر بے کار ہو چکا تھا۔ وہ مردوں کے لئے تھا زندوں کیلئے نہیں۔ وہ عوام کی سمجھ سے باہر تھا اور اس کو پڑھ کر ان کی گمراہی کا اندیشہ تھا۔ رہے علماء ان کو شرعی و ضروری علوم سے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ قرآن پر غور و تدبر کر سکیں۔ فرائض و

عبادات سے غفلت تھی ' اس لئے کہ زندگی میں مقررہ مجلسیں اور بزرگوں کے کھانے ' مرنے کے بعد قرآن خوانی ' فاتحہ ' قل ' سوم ' (تیجا) ساتا (ساتواں) چالیسواں اور سب سے بڑھ کر پیر کا وسیلہ نجات کیلئے کافی تھا۔ پھر اس کے علاوہ مشقت حماقت تھی۔ شعائر و آداب اسلام کے زوال و انحطاط کا حال اس سے معلوم ہو کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم ہی اٹھ گئی تھی۔ حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے شریعت کدے میں بھی " آداب " و " تسلیمات عرض " کا رواج تھا۔ اس سنت سے اتنا بعد ہو گیا تھا کہ عالمگیر جیسا متشرع اور فقیہہ بادشاہ بھی اس کا متحمل نہیں تھا۔ مشہور عالم مورخ میر سید عبدالجلیل بلگرامی کے صاحبزادے میر سید محمد اپنی کتاب " تبصرہ الناظرین " میں جلوس عالمگیری (۱۰۸۷ھ) کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں :۔

" ۲۷ شعبان کو ایک سقے نے جامع مسجد کے زینے پر بادشاہ کے نزدیک آ کر سلام علیک کہا۔ حکم ہوا کہ کوتوال کے حوالے کیا جائے۔ " (بست و ہفتم شعبان آداب دارے برزینہ ہائے مسجد جامع نزدیک رسیدہ سلام علیک گفت حکم شد ' حوالہ کوتوال نمایند " صفحہ ۵۹)

اخلاقی حالت

" اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی حالت بعینہ وہ تھی جو قوموں کے انحطاط اور حکومتوں کے زوال و تداخل کے موقع پر ہوتی ہے۔ ان کی معاشرت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ مورخ کا قلم بھی اس کی تصویر کھینچتے شرماتا ہے۔ فسق و معصیت ان کے آداب و تہذیب میں داخل ہو کر معاشرت کا جز بن گئی تھی اور وہ اسیر علانیہ فخر کرتے تھے۔ شراب نوشی عام تھی۔ نشہ آور چیزوں (افیون' بھنگ' تاڑی وغیرہ) کا استعمال گھر گھر تھا۔ جس سے اخلاق کے ساتھ قوائے عقلیہ اور صحت بھی برباد ہو رہی تھی۔ بازاری عورتیں دینی مجالس سے لے کر ہر مجلس کی زینت تھیں۔ حد یہ ہے کہ بعض شرفاء اپنے لڑکوں کو ان کے پاس زبان اور علم مجلسی کی تعلیم کیلئے بھیجتے تھے۔ سید انشاء کی " دریائے لطافت " (۱۲۲۳ھ) سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ارباب نشاط کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ بیسوا اور زنان بازاری شہری زندگی اور معاشرت کا اہم عنصر اور جزو لاینفک تھیں۔ جن کی حکایت و روایات' محاورات و اصطلاحات اور تلمیحات و کنایات سے ادب و زبان' تحریر و انشاء اور اخلاق و عادات سب متاثر و رنگین تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت اور مجلسی اور خانگی زندگی کا جو نقشہ " دریائے لطافت " میں نظر آتا ہے۔ اس سے تہذیب کی آنکھیں نیچی اور حیاء کی پیشانی عرق آلود ہے۔

بہت سے لوگ نکاح میں کسی تعداد کے' بلکہ نکاح کے پابند بھی نہ تھے۔ مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہو رہے تھے اور اس درخت کو گھن لگ چکا تھا۔ امراء اور متوسط طبقے کے افراد سے لے کر غرباء تک تعیش عام تھا' ہر ایک نشے میں سرشار تھا باوجودیکہ مسلمانوں کیلئے یہ نازک ترین وقت تھا' سب بے فکر اور عیش و نشاط میں مشغول تھے۔ گھر گھر یہی چرچا تھا۔ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ غرباء بھی امراء کی نقالی کرتے تھے اور امراء کی تو دنیا ہی الگ تھی' ان کے لئے نہ قانون شریعت تھا اور نہ قانون فطرت۔

ع سزاوار ہے ان کو' جو نا سزا ہے

اخلاقی انحطاط اور قومی بے حسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں کہ انگریزوں کے قدم حاکمانہ طور پر ابھی ہندوستان میں جمے نہ تھے اور ان کا وہ رعب و داب جو ۱۸۵۷ء کے بعد قائم ہوا' ابھی ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر نہیں تھا ۔ متعدد مسلمان عورتیں یوروپین تاجروں اور حکام کے گھروں میں تھیں ۔ کانپور کے منڈرو فرنگی اور اگسٹس بروک ناظم بنارس کا ذکر تو نام کے ساتھ ہے' باقی بغیر ناموں کے بھی بعض انگریزوں کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں اور سفرناموں میں آتا ہے' جن کے گھروں میں مسلمان عورتیں تھیں ۔"۱ ۔

علمی حالت

جیسے بیان ہو چکا: "قرآن مجید کو چیستاں سمجھا جانے لگا تھا' جس کو سمجھنا اور سمجھانا' اس پر غور و تدبر کرنا غیر علماء کیلئے "شجر ممنوع" قرار دے دیا گیا تھا.....

..... یہ ضرور ہے کہ دین و علم کے یہ بڑے بڑے ذخیرے جو سلف کی کوششوں سے جمع ہوئے تھے' مسلسل خرچ اور عرصہ سے آمد بند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اضافہ اور ترقی کا دروازہ بند معلوم ہوتا تھا؛ بہترین صلاحیتیں اور جوہر موجود تھے مگر ضائع ہو رہے تھے' زندگی کا صحیح مقصد اور قوتوں کا صحیح مصرف نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت اور دلیری' حوصلہ مندی' غیرت و حمیت اور دوسری اعلیٰ صفات حقیر مقاصد میں صرف ہو رہی تھیں اور جذبات نے غلط رخ اختیار کر لیا تھا' افراد تھے مگر جماعت نہ تھی ۔ اوراق تھے مگر کتاب نہ تھی ۔ زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی' اس لئے عام اور مفید حرکت نہ تھی"۲ ۔

ہندوستان کی اس گئی گزری حالت کا نقشہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مختصر ترین الفاظ میں اس طرح کھینچا ہے:

" واضح رہے کہ سید صاحب" کا ظہور اس تاریک دور میں ہوا جب اس ملک کے مسلمانوں کا سیاسی' دینی اور اخلاقی زوال آخری منزل پر پہنچا ہوا تھا ۔ شوکت و سطوت کے اس مستحکم حصار کی بنیادیں منہدم ہو رہی تھیں' جس کی دیواروں کو سیسہ پلانے میں

۱۔ سیرت سید احمد شہید ج ۱ صفحہ ۵۷-۴۷ (بتصریف) ۲۔ جب ایمان کی بہار آئی ۔ صفحہ ۱۴-۱۱

اسلامی ہند کے مایہ ناز تاجدار ' سالار اور مدبر سات صدیوں تک خون پسینہ ایک کرتے رہے ۔ سید صاحب ؒ نے مادی سروسامان سے یکسر محرومی کے باوجود محض عشق حق کی حرارت سے اس ظلمت زار میں سینکڑوں چراغ روشن کر دیئے جو اسلامیت کے درخشاں ترین دوروں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں " ۱ ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ؒ کے عربی قصیدے کا ایک شعر اس صورت حال کی تصویر ہے وہ ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں قند مکرر کے طور پر پھر پیش خدمت ہے

وانی اری الا فرنج اصحاب ثروہ
لقد افسدوا مابین دہلی و کابل ۲

غرضیکہ ہندوستان کے مسلم معاشرے کی اس زوال پذیر حالت پر شاعر مشرق کی تصویر کشی حرف آخر ہے ۔ فرماتے ہیں :

نوجواناں تشنہ لب ' خالی ' ایاغ
شستہ رو ' تاریک جاں ' روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و ناامید   چشم شاں اندر جہاں چیزے نہ دید
ناکساں منکر زخود مومن بغیر   خشت بند از خاک شاں معمار دیر

وہ کم نگاہ ' بے یقین اور ناامید ہیں ۔ ان کی آنکھ نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا وہ کچھ نہیں اپنے آپ سے منکر ہیں ۔ دیر کے معمار نے ان کی خاک سے تعمیر کی ہے ۔

اس نقشے کے بعد اقبال ؒ پیر حرم سے رسم خانقہی چھوڑنے کی التجا کرتے ہیں اور اسے نصیحت کرتے ہیں کہ نوجوان مسلم کو اس کی پریشاں نظری سے نکال کر انہیں خودی اور خود آگہی کی منزل سے ہمکنار کر ۔ فرماتے ہیں :

پیر حرم ' رسم و رہ خانقہی چھوڑ   مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت   دے ان کو سبق خود شکنی ' خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے   مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی   دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

(ضرب کلیم)

۱ جماعت مجاہدین ۔ مولانا غلام رسول مہر صفحہ ۸   ۲ ۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۵۵

ضرورت مجدد

ہندوستان کی اس حالت زار اور ایسے پس منظر کا بدیہی تقاضا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرح کوئی مصلح ، کوئی مجدد پیدا ہو اور اہل ملت اسلامیہ کو اس عقائد و اعمال کی شکست و ریخت سے محفوظ رکھے ۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں :۔

" ایسے وقت میں ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی جو دین ، علم اور صلاحیت کے اس سرمایہ سے وقت پر کام لے لے اور اس کو ٹھکانہ لگائے ، جو خانقاہوں کا حال اور درسگاہوں کا قال ، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کر دے جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں اور دوڑتے بھاگتے مدرسے ، گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم ہوں اور محرابوں میں مجاہد جو دلوں کی بجھتی ہوئی انگیٹھیاں دوبارہ دھکا دے ، افسردہ دلوں کو ایک بار پھر گرما دے اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طلب اور دین کی تڑپ کی آگ لگا دے ، جو مسلمانوں کی خداداد صلاحیتوں کو ٹھکانے لگا دے ، جس کی نگاہ دور رس اور جس کی ذات مسیحا نفس ، کسی بیکار چیز کو بھی بیکار نہ سمجھے ۔

جو امت کے ذخیرہ کے ہر دانہ اور خیاباں کے ہر تنکہ سے پورا پورا کام لے ، جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو ، اس کو اسلام کی اصطلاح میں " امام " کہتے ہیں اور یہ مقام تیرھویں صدی کے تمام اہل کمال اور مشاہیر رجال کی موجودگی میں سید صاحبؒ کو حاصل تھا ۔ "[1]

مقصد

دنیا میں جس قدر بھی دینی یا اصلاحی تحریکیں برپا ہوتی رہی ہیں ، ان کے پیچھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما رہا ہے اور اس مقصد کا تعین کرنے والے افراد یا جماعت ہی ہوتی ہے جو اس کے حصول کے لئے کوشاں رہتی ہے ۔ یہاں دست قدرت نے سید احمد شہیدؒ کو اس تحریک اصلاح کا سرخیل بنایا ۔ جو مقصد ان کے اور ان کے رفقاء کے پیش نظر تھا تاریخ نے اسے اپنے سینہ میں بڑی تفصیل سے جگہ دی ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ مقصد

۱۔ جب ایمان کی بہار آئی صفحہ ۱۴

جس قدر عظیم ہو گا اسی قدر اس کا اجر و ثواب بھی عظیم تر ہو گا۔ سید احمد شہید" اور ان کے دست راست شاہ اسمٰعیل شہید" کے پیش نظر کیا عزائم تھے؟ کیا مقاصد تھے؟ ان کا خلاصہ کچھ اس طرح بنتا ہے:۔

"سید صاحب" نے دین خالص کی دعوت پر اپنی بنیاد رکھی' انہوں نے مسلمانوں میں ایمان و یقین' جذبہ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی۔ ایک بڑی جماعت کو داعیانہ و مجاہدانہ بنیادوں پر منظم کیا اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنایا۔ ان کا منصوبہ دراصل یہ تھا کہ آگے چل کر وہ پورے ملک سے انگریزوں کو بے دخل کرنے کی کوشش کریں گے اور کتاب و سنت کی بنیاد پر یہاں حکومت شرعیہ قائم کریں گے "۱۔

"..... سید صاحب" کا مقصود محض پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کا سدباب کرنا نہ تھا بلکہ خلافت اسلامیہ کا احیاء اور حکومت "علیٰ منہاج النبوت" کا قیام و تاسیس تھا اور ان کی کوششوں کا میدان صرف پنجاب کی سکھ حکومت نہ تھی بلکہ اصل مقصود وہ ہندوستان تھا جو اس وقت انگریزوں کے اقتدار و تسلط میں آگیا تھا۔ "۲۔

"یہ سید پچھلے سترہ برس سے برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی امت مسلمہ کی دم توڑتی ہوئی زندگی میں روح تازہ پھونکتا رہا تھا۔ یہ بزرگ ہستی جہاں بھی گئی جہاد جاودانی اپنے جلو میں لے کر گئی' اس نے شب و روز کی ان تھک جدوجہد کے بعد زہد و تقویٰ' صدق و اخلاص اور قربانی و ایثار کے ایسے پیکر تیار کئے جن کی نظیر صحابہ کرام کے بعد بہت کم ملتی ہے وہ درویش صفت عظیم لوگ جو میدان شوق کے شہسوار تھے اور دنیا میں دین حق کی عظمت و سربلندی اور آخرت میں نجات اور غم و حزن سے پاک ابدی زندگی بسر کرنا جن کا پیغام اور نصب العین تھا۔ پھر وہ ان اہل جنوں کو لے کر کالے کوسوں کی مسافتیں طے کرتا لق و دق ریگزار سے گزرتا' پہاڑ پھلانگتا' وادیاں قطع کرتا' مسافرت اور موسم کی سختیاں اور صعوبتیں سہتا برصغیر کے اس گوشے میں پہنچا اور ایک ایسی اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالنے کی تگ و دو میں لگ گیا جو برصغیر میں زوال پذیر امت مسلمہ کا مرکز قوت بن سکے۔ جہاں مسلمان اللہ کے منشاء اور اسلام کی تعلیمات پر

۱۔ جب ایمان کی بہار آئی صفحہ ۲ ۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۶

عمل پیرا ہو کر آزادی کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ جہاں اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کا ایک ایسا نمونہ وجود میں لایا جا سکے جس کو دیکھ کر دنیا کے دوسرے معاشرے اس نظام کو اپنانے کی طرف مائل ہوں' جہاں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی نہیں اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو اور جہاں سے پورے برصغیر کو اس رنگ میں رنگنے اور اسے بڑھتے ہوئے انگریزی سامراج کے چنگل سے بچانے کی جدوجہد کا آغاز ہو۔"'' ۱۔

سیرت و تاریخ نگاروں نے سید صاحب ؒ کے مقاصد کا خلاصہ و نچوڑ پیش کیا ہے۔ لیکن جب ہمارے سامنے سید صاحب ؒ کے اپنے مکاتیب و خطوط موجود ہیں جن میں انہوں نے خود اس جدوجہد کے اصل مقاصد اور محرکات بیان کئے ہیں۔ تو بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سے استفادہ کیا جائے تاکہ آپ کی عظیم الشان دعوت اور جدوجہد کے حقیقی مقاصد اور اس جہاد عظیم کے اسباب و وجوہ مرتب اور مفصل انداز میں سامنے آ سکیں۔ ان مقاصد و اسباب کو درج ذیل عنوانوں کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:۔

I۔ جہاد بطور تعمیل ارشاد الٰہی

سردار یار محمد خاں کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

(i) "اس تمام جدوجہد سے فقیر کا مقصود صرف یہ ہے کہ اہل کفر و ضلالت سے جنگ کرنے کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمان خداوندی "**جاھدوا باموالکم وانفسکم**" (اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد کرو) کی تعمیل کی صورت پیدا ہو۔ فرمانبردار بندے کیلئے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔"

(ii) "ہم لوگ اللہ کے بندے اور رسول ؐ کی امت ہیں' بلاشبہ اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں' اور اپنے کو پیروان رسول ؐ شمار کرتے ہیں۔ جب ہم نے اس بات (جہاد) پر کلام الٰہی کو ناطق مان لیا ہے اور نبی اکرم ؐ کو سچا سمجھ لیا ہے۔ لامحالہ ہم نے اللہ اور اس کے حکم کی بجا آوری کیلئے کمر ہمت باندھی ہے اور اسوۂ رسول ؐ کے اتباع میں سفر کیلئے نکل کھڑے ہوئے ہیں ۲۔

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۶ ۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۳۰۷-۳۰۸

II ۔رضائے الٰہی

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے "الٰهی انت مقصودی و رضاک مطلوبی" (الٰہی تو ہی میرا مطلوب و مقصود ہے اور تیری رضا مجھے مطلوب ہے)۔ سید صاحبؒ نے اپنی تحریک کا ایک بڑا مقصد اس طرح بیان کیا ہے۔ علماء و رؤسا سرحد کے نام لکھتے ہیں:

(i) "ہم محض رضائے الٰہی کے آرزومند ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیراللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا و ما فیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں۔ ہم نے محض اللہ کے لئے علم جہاد بلند کیا ہے' ہم مال و منال' جاہ و جلال' امارت و ریاست' حکومت و سیاست کی طلب و آرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔ خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلوب نہیں"

مشائخ و امرائے ہندوستان کے نام لکھتے ہیں:۔

(ii) یہ سب کچھ محض اللہ کے لئے ہے۔ اس جذبہ الیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے کا شائبہ بھی نہیں۔ اگرچہ یہ بات فقیر کے اکثر واقفان حال پر ظاہر ہے' لیکن مزید تاکید کے لئے پھر نئے سرے سے کہتا ہوں کہ میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبہ جہاد فقیر کے دل میں موجزن ہے' اس میں رضائے الٰہی اور اعلائے کلمتہ اللہ کے مقصد کے سوا عزت و جاہ و مال و دولت' شہرت و ناموری' امارت و سلطنت' برادران و معاصرین پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہرگز دل میں نہیں ہے۔" ؎۱

III ۔غلبہ کفر اور مسلمانوں کی بے بسی

ہندوستان کے شرفاء' سادات و علماء اور مشائخ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

(i) "اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے اور ہر مقام پر جنگ کرنا لازم ہے' لیکن خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ اہل کفر و طغیان کی سرکشی حد سے گزر گئی ہے' مظلوموں کی آہ و فریاد کا غلغلہ بلند ہے۔ شعائر اسلام کی توہین ان کے ہاتھوں صاف نظر آ رہی ہے۔ اس بنا پر اب اقامت رکن دین' یعنی اہل شرک سے جہاد عامتہ المسلمین کے ذمہ کہیں زیادہ مؤکد اور واجب ہو گیا ہے۔"

؎۱ ایضاً صفحہ ۳۰۹-۳۰۸

والی کاشکار (چترال) کے نام لکھتے ہیں:

(ii) "تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائی اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائر اسلام اٹھ گئے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامنگیر ہوا۔ دل میں غیرت ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے"۱۔

IV۔ اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے سنت اور استخلاص بلاد اسلامیہ

شاہ سلیمان کے نام لکھتے ہیں:۔

(i) "اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آزمائی کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، رسول اکرمؐ کی سنت زندہ ہو، اور مسلمانوں کا ملک کفار و مشرکین کے قبضے سے نکل جائے، اس کے سوا کوئی مقصود نہیں"

(ii) "اس فقیر کو مال و دولت اور حصول سلطنت و حکومت سے کچھ غرض نہیں۔ دینی بھائیوں میں سے جو شخص بھی کفار کے ہاتھوں سے ملک کو آزاد کرے، رب العالمین کے احکام کو رواج دینے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پھیلانے کی کوشش کرے گا اور ریاست و عدالت میں قوانین شریعت کی رعایت و پابندی کرے گا، فقیر کا مقصود حاصل ہو جائے گا اور میری کوشش کامیاب ہو جائے گی"۲۔

V۔ دین کیلئے قیام سلطنت

ایک مکتوب میں اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ قیام دین کیلئے سلطنت اور سلطہ کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے صحیح فرمایا تھا۔

ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

جب تک امارت نہیں احکام شرعی کا نفاذ ممکن نہیں:۔

(i) "حقیقت میں مطابق مقولہ سلطنت و مذہب جڑواں ہیں (**الملک والدین توامان**) اگرچہ یہ قول حجت شرعی نہیں ہے لیکن مدعا کے موافق ہے۔ کہ دین کا قیام

۱۔ سیرت سید احمد شہیدؒ ایضاً صفحہ ۳۰۹-۳۱۰ ۲۔ ایضاً صفحہ ۳۱۰-۳۱۱

سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام جن کا تعلق سلطنت سے ہے' سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کاموں کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھوں ان کی ذلت و نکبت اور شریعت مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مساجد و معابد کی تخریب جو ہوتی ہے' وہ بخوبی ظاہر ہے"

(ii) سردار سلطان محمد خاں اور سردار سید محمد خاں کے نام مکتوب گرامی میں رقم طراز ہیں:۔

"میرا اس منصب (امامت) کو قبول کرنے سے سوائے اس کے کوئی مقصود نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم و نسق قائم ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی خواہش اور غرض نہیں۔ مثلاً روپے پیسے کے خزانے یا ملکوں اور شہروں پر تسلط یا حصول سلطنت و ریاست یا اہل حکومت و صاحب اقتدار لوگوں کی تذلیل یا اپنے ہمسروں پر اپنے احکام کا اجراء یا اپنے ہمعصروں پر فوقیت و امتیاز' قطعاً و بالکلیہ شامل نہیں۔ بلکہ ایسی بات نہ کبھی زبان پر آتی ہے نہ کبھی خیال میں گزرتی ہے۔ تاج فریدوں و تخت سکندری کی قیمت میرے نزدیک ایک جو کے دانے کے برابر بھی نہیں۔ کسریٰ و قیصر کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا' ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے کسی کی مخالفت کے بغیر جاری ہو جائیں' خواہ میرے ہاتھ سے خواہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے' پس ہر ترکیب و تدبیر جو اس مقصد کے حصول کے لئے مفید ہو گی' عمل میں لاؤں گا" ا؎

VI۔ زبانی دعوت و تبلیغ "جہاد" کے بغیر ممکن نہیں

ہندوستان کے علماء و مشائخ کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"چونکہ زبانی دعوت و تبلیغ شمشیروسناں سے جہاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتی' اس لئے راہنماؤں کے پیشوا اور مبلغوں کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں کفار سے جنگ کرنے کے لئے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت اور شریعت کی سربلندی و ترقی اسی رکن جہاد کی اقامت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی۔"۲؎

۱۔ ایضاً صفحہ ۱۳۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳ ۲۔ سیرت سید احمد شہید ج۔ ۱ صفحہ ۱۴۔ ۳۱۳

ایک غلط فہمی کا ازالہ

"سید صاحب" کی تحریروں اور ذاتی بیانات کے بعد اگرچہ بظاہر اس کی گنجائش نہیں کہ اس کے سوا کوئی اور خیال قائم کیا جائے کہ وہ صاف صاف اعلائے کلمتہ اللہ کے لئے کوشاں تھے اور دین کے ایسے غلبہ اور اقتدار اعلیٰ کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ جس میں بے تکلف احکام شرعی کا نفاذ اور حکومت الہیہ کا قیام ہو سکے اور " **حتی لا تکون فتنتہ و یکون الدین کلہ للہ** " (۸:۳۹) (یہاں تک کہ شرک کا غلبہ نہ رہنے پائے اور سارا دین اللہ ہی کیلئے ہو جائے) کی حقیقت کا ظہور ہو۔ "۱۔۔۔۔۔ لیکن بعض اہل قلم اور نادان دوستوں کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ سید صاحب" کو صرف تحریک آزادی ہند کا ایک راہنما سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد وحید ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرا کے ایک خاص ملکی حکومت قائم کرنا تھا جس میں عقیدہ و اصول اور حکمران کے دین و مذہب اور مسلک و عمل کی کوئی بحث نہ تھی۔ مثلاً لکھنے والوں کی غلط فہمی ملاحظہ ہو:۔

" آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے اس کے بعد حکومت کس کی ہو گی، اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہونگے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے" ۲۔

دراصل اس غلط فہمی کا سبب خود سید صاحب" کے بعض مکتوبات کے اقتباسات ہیں جو آپ نے مہاراج دولت رائے سندھیا کے وزیر و برادر نسبتی " راجہ ہندو راؤ " اور ریاست گوالیار کے غلام حیدر خاں کو لکھے۔

" جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا ثمر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے، جن کو ان کی طلب ہو گی اور ان (ملکی) حکام و اہل ریاست کی شوکت و قوت کی بنیاد مستحکم ہو گی۔ ہم کمزوروں کو والیان ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و مال سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنی مسند حکومت پر برقرار رہیں"۳۔

۱۔ سیرت سید احمد شہید" صفحہ ۳۲۱ ۲، ۳، ۴ بحوالہ سیرت سید احمد شہید" صفحہ ۳۲۲-۳۲۱

مولانا ابو الحسن علی ندوی اس غلط فہمی کا ازالہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"ان اقتباسات سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب" ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و تسلط اور انگریزی اقتدار کو حقیقی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے کے ازالے اور ان بیگانگان بعید الوطن' اور "تاجران متاع فروش" کے اخراج کے لئے غیر مسلم والیان ریاست اور اہل حکومت و طاقت کو اپنے ساتھ جدوجہد کرنے اور تعاون کی دعوت دیتے ہیں جو ان کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اس منظم اور متحد مقابلے اور جدوجہد ہی میں ان کی ریاست اور طاقت کی بقا ہے۔ ان کی زندگی اور عزت و منزلت اسی پر منحصر ہے کہ انگریزی غلبہ و اقتدار کا یہ سرطان ہندوستان کے جسم سے خارج کر دیا جائے اور ملک کو اس غیر ملکی طاقت کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے بعد وہ اہل ریاست و سیاست جنہوں نے اس مقصد کیلئے اشتراک عمل کیا ہے اپنے منصبوں (ریاست اور امارت کی گدیوں) پر فائز رہیں گے۔ وہ مناسب عہدوں اور منصبوں سے سرفراز ہوں گے اور ان کی شوکت و سطوت میں' جو انگریزوں کے اثر اور تدبیر سے ہردم متزلزل اور روبزوال ہے۔ استحکام پیدا ہو جائے گا۔"

"یہ سب حرف بحرف صحیح اور تاریخی و سیاسی حیثیت سے نہایت معقول اور متوازن دعوت و اعلان ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ گویا انگریزوں کے اخراج کے بعد سید صاحب" اقتدار اعلیٰ ہندوستان کی حکومت والیان ریاست اور غیر مسلم اشخاص کے حوالے کر کے خود گوشہ نشین اور ذکر و عبادت میں مشغول ہو جائیں گے اور ہندوستان ایک ایسی غیر مسلم ریاست یا مشترک ہندو مسلم ریاست کے قیام پر رضامند ہو جائیں گے جس میں اسلام و قوانین اسلام کو کوئی بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو گی اور اقتدار اعلیٰ اسلامی طاقت کے ہاتھ میں نہ ہو گا' یہ سید صاحب" کی زندگی' ان کے اصلی جذبات اور ان کی روح تحریک سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور انہیں خطوط کے اندر اس کے خلاف صریح شہادتیں موجود ہیں۔"[1]

اس سلسلے میں جو ان کی تحریک کے مقاصد اور اسباب ہیں ہم ان کے خطوط کے

1۔ سیرت سید احمد شہید" صفحہ ۳۲۲-۳۲۳

اقتباسات نقل کر چکے ہیں، بہت واضح ہیں۔ صرف ان میں سے دو کو دوبارہ نقل کرتے ہیں:

(i) "دین کا قیام سلطنت سے ہے اور وہ دینی احکام جن کا تعلق حکومت سے ہے سلطنت کے نہ ہونے سے صاف ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور مسلمانوں کے کام کی خرابی اور سرکش کفار کے ہاتھ سے ان کی ذلت و نکبت اور شریعت مقدسہ کے شعائر کی بے حرمتی اور مسلمانوں کے معابد و مساجد کی جو تخریب ہوتی ہے وہ بخوبی ظاہر ہے۔"[1]

سید صاحبؒ کے سامنے صرف ہندوستان کی آزادی یا غلامی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے تو ساری دنیا پر اللہ کی حکومت کے قیام اور تمام انسانوں پر اللہ کے قوانین کے نفاذ کا مسئلہ ہے، لکھتے ہیں:۔

(ii) "اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک عالم میں رب العالمین کے احکام، جن کا نام شرع متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں"[2]۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی صاحب نے صحیح لکھا ہے:۔ "اس داعی الی اللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ کے متعلق، جس سے بڑھ کر فکر اسلامی کا حامل اور خلافت و نبوت کا پرتو کامل کم سے کم ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں ہمارے علم میں پیدا نہیں ہوا، یہ خیال کہ وہ صرف آزادی ملک اور انگریزوں کے اخراج کا داعی تھا اور اس کا مقصد پردیسیوں کی حکومت کا ختم کر دینا تھا، اس کو حکومت کے اصول و مقاصد اور اس اخلاقی و دینی نتائج سے بحث نہ تھی، ایک ایسی نسبت ہے جس کے متعلق اس کی روح کو شکایت کا موقع ہے کہ۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وزدرون من نہ جست اسرار من

۱۔ ایضاً صفحہ ۲۵-۳۲۴ ۲۔ ایضاً صفحہ ۳۲۵

آغاز سفر

" غلامی کی رات اُمڈتی چلی آتی ہے ' مشرقی ساحل سے سرہند کی سرحد تک کے علاقے پر انگریزوں کا سامراجی سایہ پھیل چکا ہے۔ بادشاہ ہندوستان کی سلطنت عملاً لال قلعے تک محدود ہو چکی ہے۔ جنوبی اور وسطی ہندوستان میں مرہٹوں کی مار دھاڑ جاری ہے۔ ادھر سکھ شمال میں دریائے ستلج سے پشاور تک کے علاقے میں عذاب کا کوڑا بنے مسلمانوں پر برس رہے ہیں۔ پورے برصغیر میں جہاں کہیں کسی آزاد ریاست کا جزیرہ ہے وہ بے بال و پر ' یا تو انگریزوں کے رحم و کرم پر ہے یا سکھ غارت گروں کی جولان گاہ "

سید احمد شہیدؒ

۱۲۰۱ھ تا ۱۲۴۶ھ

۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۱ء

" ایسی حالت میں یہ مرد درویش اٹھا۔ اس نے پہلے نواب امیر خاں کو حق اور مسلمانوں کی حمایت و دفاع پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس عہد زوال میں جب ہر طرف تاریکی طاری تھی ' روشنی کی کرن اور ابھرتی ہوئی قوت تھے[1] " یہ قوت روہیلکھنڈ کے افغانوں کی طاقت تھی ' جن کی قیادت سنبھل (ضلع مراد آباد) کا ایک حوصلہ مند افغان زادہ امیر خاں کر رہا تھا۔ امیر خاں کے ساتھ روہیلکھنڈ اور شمالی ہند کے دلیر اور حوصلہ مند پٹھانوں اور سپاہ پیشہ نوجوانوں کی کثیر التعداد طاقت اور جمعیت رہتی تھی ' جس کو مرہٹہ سردار اور راجپوت والیان ریاست ہمیشہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں رہا کرتے تھے اور جس کی شمولیت فتح و شکست کیلئے اکثر فیصلہ کن ثابت ہوا کرتی تھی۔ اس جمعیت میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر ' مسلمانوں کا گرم اور تازہ خون ' ہندوستان کی فاتح طاقت ' بچا کھچا سرمایہ اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے "۲۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ مرد درویش۔ سید احمد شہیدؒ کون تھا؟

۱۔ جب ایمان کی بہار آئی۔ صفحہ ۱۷ ۲۔ سیرت سید احمد شہیدؒ ' ج ۱ صفحہ ۱۰۶

تیرھویں صدی کا آغاز تھا۔ جس خاندان کا آغاز شیخ الاسلام امیر کبیر قطب الدین محمد مدنیؒ سے ہوا، جنہوں نے ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں ہندوستان آکر "کڑا مانک پور" کے نواح میں جو اس زمانے میں الہ آباد میں تھا، جہاد کیا۔ اس خاندان کے آخری مورث شاہ سید علم اللہؒ ہیں، جو عالمگیر کے زمانے میں تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مشہور خلیفہ اور جانشین حضرت آدم بنوریؒ کے فیض سے مستفیض تھے اور دیار مشرق میں ان کے خلیفہ خاص تھے۔ اس خاندان کے ممتاز افراد مجدد دہلویؒ کے فیض درس اور فیض صحبت سے سیراب تھے۔

سہ آتشہ

اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کی برکتیں اور سعادتیں جمع ہو گئیں۔ مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کے فضل و کمال اور مجاہدہ وصال کے دو آتشے سے رائے بریلی کے خم کدے میں ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا۔ یہ سادات حسنی کا خاندان تھا۔ اس خاندان میں چودھویں کا چاند طلوع ہوا۔ ۱۲۰۱ھ میں مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ کی پیدائش ہوئی۔ چند سال بعد یہ چاند مجاہدۂ عرفان کا آفتاب بن گیا

؎ نہ شبم، نہ شب پرستم، کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم، ہمہ ز آفتاب گویم[1]

تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد بریلویؒ کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔ جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی گہرائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔

"سید صاحبؒ" کے خلفاء ہر صوبے اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید و اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے، مشرکانہ رسوم مٹائے جا

۱۔ ایضاً صفحہ ۲۴

رہے تھے ۔ بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں ' نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے ۔ جو مسلمان نہ تھے وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے ۔ شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں ۔ تاڑی اور سیندھی کے خم پھوڑے جا رہے تھے ۔ بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کیلئے علماء حجروں اور امراء ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی لاچاری ' مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے ہوئے تھے اور مجاہد تبلیغ و دعوت میں لگے تھے ۔ "[۱]

سید صاحب ؒ ۶ ر صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے ۔ تعلیم میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہوئی ۔ مردانہ کھیلوں خصوصاً سپاہیانہ انداز کے کھیلوں مثلاً کبڈی میں بہت دلچسپی تھی ۔ خدمت خلق کا ایک جذبہ پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ اور خدا پرست حیران رہ گئے ' عبادت و ریاضت الٰہی کا ذوق حد درجہ تھا ۔ رات کو تہجد گزاری اور دن کو خدمت گزاری ' تلاوت و دعا اور تفکر قرآن میں مگن رہتے ۔ ۱۸ر۱۷ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد چند اعزہ و اقربا کے ساتھ لکھنؤ کا سفر اختیار کیا ۔ وہاں احباب سب تتر بتر ہو گئے ۔ دل برداشتہ دہلی جانے کا ارادہ کیا ' احباب آمادہ نہ ہوئے تو سید صاحب تن تنہا دہلی پہنچے ۔ شاہ عبدالعزیز ؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد ۱۲۲۳ھ میں رائے بریلی لوٹے ۔ دوسری دفعہ دہلی کا سفر تقریباً ۱۲۲۶ھ میں اختیار کیا ۔ ۱۲۲۷ھ میں نواب امیر خاں کے لشکر میں شامل ہو گئے ۔ نواب امیر خاں کے لشکر میں عسکری تربیت مکمل کی ۔ سید صاحب ؒ کا یہ سفر اس عظیم مقصد (اقامت جہاد) کے تحت اشارۂ غیبی تھا ۔ لشکر میں آپ نے دعوت و ارشاد اور جذبہ جہاد کی وعظ و تلقین کی ۔ چھ سال نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کیے مگر جب نواب امیر خاں نے ۱۲۳۱ء میں انگریزوں سے صلح کر لی تو آپ نے نواب امیر خاں کی رفاقت کو خیرباد کہہ دیا ۔ تیسری دفعہ دہلی تشریف لائے ۔ شاہ عبدالعزیز ؒ نے اکبری مسجد میں قیام کا بندوبست کیا ۔ آپ نے مسجد اکبری میں ارشاد و تربیت کا آغاز کیا ۔ یہیں مولانا عبدالحی ؒ اور مولانا اسمٰعیل ؒ کہ خاندان ولی اللہ کے چشم و چراغ اور شاہ عبدالقادر ؒ اور شاہ رفیع الدین ؒ کے بعد ہندوستان کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے ۔ علمی تبحر ' رشد و صلاحیت اور تقویٰ و للہیت میں ممتاز تھے ' نے آپ کے

ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس بیعت سے دہلی کے بڑے بڑے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے لگے۔ آپ نے دہلی سے قدم باہر نکالا' غازی الدین نگر' مراد نگر' میرٹھ' سردھنہ' بڑھانہ' پھلت' مظفر نگر' دیوبند' سہارنپور اس کے نواح' انبیٹھ' نانوتہ' ہر جگہ لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ کا پورا سفر باران رحمت کی طرح تھا' جہاں سے گزرے سرسبزی و شادابی' بہار و برکت چھوڑتے گئے" جہاں آپ تھوڑی دیر ٹھہر گئے وہاں مساجد میں رونق' اللہ رسولؐ کا چرچا' ایمانوں میں تازگی' اتباع سنت کا شوق' اسلام کا جوش پیدا ہو گیا اور کہیں کہیں شرک و بدعت اور رفض کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔"[1]

اس سارے سفر میں مولانا محمد اسماعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ ہمرکاب تھے۔ مولانا عبدالحیؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ سواری کے ساتھ پیدل چلتے' لگام تھامتے' جوتیاں اٹھاتے' آپ سوتے تو وہ ساری رات جاگتے پہرہ دیتے۔ اب شاہ عبدالعزیزؒ سے رخصت لے کر اپنے وطن رائے بریلی پہنچے۔ یہاں بھی ایک تبلیغی دورہ کیا۔ ہزاروں لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اب پھر لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ لکھنؤ کے اس قیام میں لکھنؤ کے علماء و فضلاء نے بیعت کی۔ امراء اور تاجر مرید ہوئے بڑے بڑے فساق' چور اور ڈاکو ولیوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ لکھنؤ سے واپسی پر دوبارہ وطن مالوف رائے بریلی پہنچے' اس دوران میں جہاد کا ذوق و شوق بہت زیادہ تھا۔ خود بھی ہتھیار سجاتے' رفقاء کو بھی ترغیب دیتے۔ اس طرح جہاد کی ایک عظیم تحریک منظم ہونے لگی۔ اسی دوران سید صاحبؒ نے حج کی تیاری کی۔ حج کی تیاری کیا تھی گویا وہ بھی دعوت و ارشاد اور جہاد کی تربیت تھی۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۷ھ کو مکہ مکرمہ میں ورود مسعود ہوا۔ یکم ذی قعدہ ۱۲۳۸ھ کو وطن کی واپسی کیلئے رخت سفر باندھا۔ بمبئی کے راستے رائے بریلی واپسی ہوئی۔

سفر ہجرت

سید صاحبؒ نے جہاد کے عزم سے ہندوستان کو خیرباد کہا۔ مخلص رفقاء کے ہمراہ ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور "ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچنے کیلئے آپؒ نے ہندوستان' بلوچستان' افغانستان کا نہایت طویل اور بے حد پر مشقت سفر اختیار کیا۔ آپ کی بلند حوصلگی اور جوش جہاد اور مجاہدین کی جفاکشی' صبر و ضبط اور شوق جہاد کا اندازہ

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ ج۔ ا صفحہ ۱۴۱

لگانے کیلئے اتنا کافی ہے کہ ہندوستان ' سرحد اور افغانستان کے نقشے پر ایک نظر ڈال لی جائے اور راجپوتانے ' مارواڑ ' سندھ ' بلوچستان ' افغانستان اور صوبہ سرحد کے ان ریگستانوں ' میدانوں ' پہاڑوں ' دروں ' جنگلوں اور دریاؤں کا تصور کیا جائے جو ان مجاہدین کو طے کرنے پڑے ۔ حقیقت میں اس ھفتخواں کا سر کرنا خود ایک مستقل جہاد تھا ' بعض جگہ پانی کی قلت ' خوراک کی کمی ' راہ کی خستگی ' مقامات کی دشوار گزاری ' قزاقوں کا خطرہ ' بھوک اور پیاس کی شدت ' اجنبی قوموں ' اجنبی ملک ' نئی نئی زبانوں کا سامنا ' شبہات اور اندیشے ' تحقیقات و تجسس ' یہ تمام چیزیں پیش آئیں مگر ان کے قدم میں لغزش اور ارادے میں تذبذب نہ پیدا ہوا ۔ اس کے ساتھ اگر یہ تصور کیا جائے کہ اس قافلے میں دہلی ' اودھ کے کیسے کیسے نازک طبع ' امیر گھرانوں کے کیسے کیسے ناز پروردہ اشخاص ' صاحبزادے ' شرفاء ' سادات علماء اور مشائخ تھے تو اس روح اور جوش و بے خودی کا اندازہ ہوتا ہے جو میر کارواں نے ان میں پیدا کر دی اور جس کی پرورش اور ترقی اس کی صحبت میں برابر ہو رہی تھی "[1]۔

اس سفر ہجرت کی آخری منزل بالا کوٹ تھی ۔ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ (۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء) آپ نے نوشہرے میں قیام کیا شرعی دستور کے مطابق لاہور کی حکومت کو اعلام نامہ تحریر فرمایا : لاہور کی حکومت کیا تھی ۔ مختصراً " اس (سکھا شاہی) غلامی ' مذہبی بندش اور ذلت آمیز طرز عمل سے مسلمانوں کے اخلاق پست ہو گئے تھے ۔ ساری قوم پر بے اعتمادی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی اور وہ زندگی کو موت پر ترجیح دیتے تھے ۔ عقائد و اخلاق و عادات مسخ ہو رہے تھے ۔ دینی حمیت اور اسلامی روح سے پوری قوم محروم ہوئی چلی جا رہی تھی ۔ "

آغاز جہاد

پشاور دو تین روز قیام رہا ۔ وہاں سے ھشت نگر تشریف لے گئے ' وہاں چند روز قیام کر کے اور وہاں کے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت و تبلیغ فرما کر خویشگی ہوتے ہوئے نوشہرے تشریف لائے ' " جہاں سے اس محبوب عمل ' عبادت عظمیٰ کا آغاز کیا ' جو برسوں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا حاصل اور اس پر مشقت و پر محن سفر کا مقصد تھا ۔ جس کی نظیر پچھلی

۱ ۔ ایضاً صفحہ ۳۴۵

صدیوں کے فاتحین اور کشور کشاؤں کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے اور جو صرف قوت ایمانی ' شوق و محبت اور اعتماد علی اللہ کا کرشمہ تھا ' یہ سید صاحب کی عظمت و عزیمت اور حسن تربیت کی ایسی یادگار ہے جس سے ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی تاریخ خالی ہے۔ "

۱؎

سکھا شاہی کو اعلام نامہ

شریعت مطہرہ کے مطابق نوشہرے قیام کے دوران سکھا شاہی کو آپ نے اس طرح ایک اعلام نامہ ارسال کیا:۔

(i) یا تو اسلام قبول کر لو ' (اس وقت ہمارے بھائی اور مساوی ہو جاؤ گے) لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔

(ii) یا ہماری اطاعت اختیار کر کے جزیہ دینا قبول کر لو ' اس وقت ہم اپنے جان و مال کی طرح تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

(iii) آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں ' تو لڑنے کیلئے تیار ہو جاؤ ' مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہو گی جتنی ہم کو شہادت کی ہے " ---۲؎

اسی دوران خبر ملی کہ بدھ سنگھ لشکر کے ساتھ " اکوڑے " میں داخل ہو گیا ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا کوئی شخص ہتھیار نہ کھولے ' ہوشیاری سے مستعد اور تیار رہے اور جس کو کھانا پکانا ہو دن کو ہی پکا کر کھا لے "

اکوڑے کی جنگ ' حضرو کا چھاپہ اور بیعت امامت ' شیدو کی جنگ ' رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جنرل سے مقابلہ ' جنگ زیدہ اور یار محمد خان کا قتل ' جنگ مایار ' پشاور کی فتح اور سپردگی ' قضاۃ و محصلین کا قتل عام ' ہجرت ثانیہ اور کشمیر کی طرف رخت سفر یہ مسلسل کڑیاں ہیں اس عظیم جہاد کی جو معرکہ بالا کوٹ پر منتج ہوا۔ "

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

" یہ قافلہ اپنے سالار کی سرکردگی میں جن راہوں سے گزر گیا اپنے پیچھے روشن و

۱؎ سیرت سید احمد شہیدؒ ج۔۱ صفحہ ۳۹۲ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۹۷۔ ج۔۱

تابندہ نقوش چھوڑ گیا ۔۔۔ آج یہ عظیم انسان اپنے ساتھیوں سمیت خاک و خون میں غلطاں مٹی کوٹ کے دامن میں دھان کے کھیتوں کے درمیان شہادت کی نعمت ابدی کا خلعت پہنے پڑا ہے ۔ اس مرد حق کی شخصیت عجیب شخصیت تھی، مجسم شریعت اور سراپا اتباع سنت، ظاہری فضائل اور باطنی مراتب کا دلکش مرقع، ہروقت خشیت الٰہی سے لرزہ بر اندام، اخلاص اور سوز و دردمندی کی تصویر، جس کو دیکھ کر خدا یاد آ جاتا، جس کی صحبت میں دل دنیا سے سرد ہو جاتا، آخرت کی فکر قلب و ذہن پر چھا جاتی، عبادت اور ذکر کا ذوق جلا پاتا، رضائے الٰہی کی طلب اور راہ حق میں جدوجہد اور شہادت کی آرزو اس طرح بے چین کر دیتی کہ آدمی گھربار، اہل و عیال، وطن ہر شے چھوڑ کر راہ حق میں نکل کھڑا ہوتا جس کے لئے دنیا کے بندے جیتے اور مرتے ہیں ۔ یہ مرد شہید" جن دنوں امیر خاں کے لشکر میں ہوا کرتا تھا محبت الٰہی کے تقاضے کا احساس اکثر ایک رباعی کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتا تھا:۔

؎ اے آنکہ زنی دم از محبت   از ہستی خویشتن بہ پرہیز
؎ برخیز و بہ تیغ تیز بنشیں   یا از سر راہ دوست برخیز

اے وہ کہ تو محبت کا دم بھرتا ہے اپنی ہستی سے پرہیز کر
اٹھ کھڑا ہو اور تیز تلوار کے ساتھ بیٹھ یا دوست کی راہ سے اٹھ جا

اس نے محبت الٰہی کے جوش میں اپنی ہستی کو مٹا دیا ۔ راہ دوست پر چلتے ہوئے تیغ تیز کی رفاقت اختیار کی اور آج محبت کا وہ تقاضا پورا کر دیا ہے ۔ جو اسے ہر آن مضطرب اور بے قرار رکھتا تھا، "فعاش سعیدا و مات شہیدا" اس کی زندگی سعادت سے بہرہ مند تھی اور موت شہادت کی موت" [۱]۔

؎ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن   نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

منزل مقصود

" بالا کوٹ کی اس سرزمین پر ان مبارک انسانوں کا وہ مبارک سفر ختم ہوا جس کی ابتدا ۷ جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ (۱۷؍ جنوری ۱۸۲۶ء) کی صبح کو سید احمد شہید" نے اپنے غازیوں کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی سے کی تھی اور ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۹۔۱۸

کا شعلہ بے تاب اور شہادت فی سبیل اللہ کا ایسا جذبہ صادق پیدا ہو گیا تھا کہ ان کو اپنی جان وبال جان اور اپنا سر وبال دوش معلوم ہونے لگا تھا اور ان کے ہر بن مو سے یہ صدا آتی تھی:

؎ جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست   اس نوید جانفزا سے سر وبال دوش ہے "[1]

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

۱۱۹۳ھ تا ۱۲۴۶ھ

۱۷۷۸ء تا ۱۸۳۱ء

سید احمد شہیدؒ کی سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں مولانا عبدالحیؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے نام آتے ہیں۔ مولانا عبدالحیؒ، شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد تھے تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ان کے بھتیجے شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اور شاہ عبدالغنیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ تحریک مجاہدین میں ان کی قربانیوں کی داستاں بہت طویل ہے۔ دونوں کا علمی مقام بھی مسلم ہے۔ سید احمدؒ کے ساتھ ان کی عدیم المثال محبت اور رفاقت، ان کے ساتھ روز افزوں وفاداری بشرط استواری، تحریک میں ان کی جدوجہد مرتے دم تک جاری رہی۔ شاہ عبدالحیؒ ۱۸۲۸ء میں وفات پا گئے۔ یہ دونوں سید احمد شہیدؒ کے رفقاء مشہور تصنیف "صراط مستقیم" کے مشترکہ مولف تھے۔

سید احمد شہیدؒ کو جماعت مجاہدین کا اگر جسم مانا جائے تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ روح تھے۔ سید صاحبؒ کو اگر جماعت مجاہدین کا دل تسلیم کیا جائے تو شاہ اسمٰعیلؒ، محرک جان تھے، سید احمد شہیدؒ کو اگر جماعت کا امیر مانا جائے تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ قافلہ سالار تھے۔ جسم و جاں کے اس رشتے کی انتہا تو یہ تھی کہ دونوں نے اکٹھے بالا کوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کیا اور عالم جاودانی میں بھی یہ رشتہ برقرار رہا۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بڑے کثیر التصنیف تھے۔ تحریک مجاہدین کے وہ نفس ناطقہ تھے۔ ان کے مکتوبات اور رسائل تحریک کے اغراض ومقاصد کی بہت واضح اور زوردار ترجمانی کرتے تھے۔ تحریک کی مدافعت میں وہ

۱۔ جب ایمان کی بہار آئی صفحہ ۔

۱۸۳۱ء) کو منزل مقصود پر پہنچ گئے" ۱۔ یہ منزل مقصود کیا تھی؟ آباد شاہ پوری کی زبانی سنئے:۔ "تاریخ کا مسافر دریائے کنہار کے مغربی کنارے سرنگوں بیٹھا ہے' پہاڑ کی دو متوازی دیواریں شمالاً جنوباً چلی گئی ہیں۔ کنہار ان دیواروں کے درمیان کوئی آدھ میل چوڑے خلاء میں پیچ و خم کھاتا محو سفر ہے۔ شوریدہ سری کے عالم میں کبھی وہ مشرقی دیوار سے جا ٹکراتا ہے اور کبھی مغربی دیوار سے۔ دریا جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے دائیں بائیں سے کئی برساتی نالے پہاڑوں سے اتر کر اس سے ہم آغوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شمال میں جہاں دریا وادی کاغان سے گزرتے' اپنی راہ میں آنے والی ایک عظیم دیوار میں سے راستہ بناتے ہوئے نئی وادی میں قدم رکھتا ہے۔ وہاں اونچے پہاڑ کے نشیب و فراز پر آباد بالا کوٹ اور گردونواح پر سکوت مرگ طاری ہے۔ سورج دن بھر ایک خونچکاں المئے کا نظارہ کرنے کے بعد پہاڑ کی اوٹ میں غائب ہو چکا ہے اور وادی میں اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔ بالا کوٹ کے درودیوار سے اٹھنے والے شعلے اور دھوئیں کے مرغولے دم توڑ چکے ہیں اور اب فضا دھرتی کے سینے سے اٹھنے والی آہوں سے دھواں دھواں ہے۔ تاریخ کا مسافر محسوس کرتا ہے کہ یہ آہیں نیزوں کی تیز نکیلی انیاں ہیں جو اس کے سینے میں پیوست ہوئی جاتی ہیں۔ تاریخ کے کتنے ہی دردناک منظر اس نے دیکھے ہیں۔ ان مناظر نے اس کا دل سنگ خارا میں بدل ڈالا ہے۔ وہ بڑا ہی کٹھور دل ہے لیکن کچھ منظر ایسے بھی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ کٹھور دل موم کی طرح پگھل جاتا ہے اور خون آنکھوں سے بہہ نکلتا ہے۔ آج ایسا ہی ایک منظر اس کے سامنے ہے۔ اس کا دل لہو لہو اور جگر قاش قاش ہے۔ اشکوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کنہار کے خوں رنگ چہرے پر جمی ہیں۔ کبھی کبھی اٹھتی ہیں اور مٹی کوٹ گاؤں کے دامن میں بلند و پست پہاڑی کھیتوں پر جا پڑتی ہیں۔ جو مٹی کوٹ نالے سے لے کر "ست بنے نالے" سے پرے تک چلے گئے ہیں' ان کھیتوں میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ ان غریب الدیار اہل جنوں کی لاشیں جو رائے بریلی کے ایک خدا پرست درویش سید کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حق کا کلمہ بلند کرنے اٹھے تھے:۲۔

"بالا کوٹ کے اس معرکہ میں سید احمد شہید" مولانا محمد اسماعیل شہید" اور دوسرے ان مبارک انسانوں نے اللہ کی راہ میں جام شہادت نوش کیا جن کے دلوں میں عشق الٰہی

۱۔ جب ایمان کی بہار آئی۔ صفحہ ۴۲-۴۱ ۲۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۶'

قلم کے ویسے ہی مرد میدان تھے جیسے مصاف جنگ میں تلوار کے سورما۔ جنگ حضرو' جنگ شیدو اور جنگ شکیاری میں ان کے یہ جوہر نمایاں ہو چکے تھے۔ جنگ شکیاری میں دو تین روز کے مسلسل فاقہ کے باوجود سکھوں کی ایک بڑی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں ان کی شہادت کی انگلی شہید ہو گئی تو فرماتے تھے :۔ "اگر اللہ تعالیٰ قبول فرمائے تو میری یہ انگشت شہادت کی ہے' ورنہ بہت سے زخم لگتے ہیں اور ان میں کچھ ثواب نہیں ہوتا" ا؎

پیدائش

"یہ زمانہ اکبر شاہ کا ہے جب ہمارے شہید دین محمدیؒ کا ظہور ہوا۔" ولادت باسعادت ۱۲/ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ ننھال میں "پھلت" ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت

چھ سال کی عمر میں آپ مکتب نشین ہوئے۔ اللہ نے بلا کا حافظہ دیا تھا۔ جو چیز نظر سے گزری ازبر ہو گئی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید صرف حفظ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے مفاہیم و مطالب بھی ازبر کر لئے۔ دو تین سال میں صرف و نحو پر ایسا عبور حاصل کر لیا کہ اچھے اچھے صرفی و نحوی رشک کرنے لگے۔ اس دور میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ :

؎ علم دین فقہ است و تفسیر و حدیث — ہر کہ خواند بیش ازیں گردد خبیث

(علم دین نام ہے فقہ' تفسیر اور حدیث کا۔ جو شخص اس کے علاوہ کچھ سیکھے وہ خبیث ہے ۔)

شاہ صاحبؒ نے صدا جیسی لاتخل کتاب بھی پڑھی۔ علم ریاضی' علوم جغرافیہ اور تاریخ کسی زمانے میں مسلمانوں کے خصوصی علوم سمجھے جاتے تھے مگر اس دور میں ان کی تعلیم کا رواج جاتا رہا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے خاندان کے اسلوب تعلیم کی پیروی میں اقلیدس کے اصول موضوعہ و علوم متعارفہ حفظ کر لئے۔ "ریاضی کی جتنی شاخیں تھیں سب واجب الاحترام شہید نے طے کر لیں۔ اور اب ریاضی میں لاجواب ہو گیا.... پیارا شہیدؒ چھوٹی سی عمر میں لائق ریاضی دان بن گیا" ۲؎

ا؎ سوانح احمدی صفحہ ۱۰۷ ۲؎ حیات طیبہ صفحہ ۳۶-۳۵

"نواب صدیق حسنؒ کا بیان ہے کہ علم حساب ان کی انگلیوں پر رہتا تھا" ۱؎ مولانا شہیدؒ جنہیں اول دن سے تعلیم دی گئی تھی، سب سے زیادہ تواریخ سے دلچسپی رکھتے تھے اور چونکہ بغیر جغرافیہ جانے تاریخ فضول ہے۔ اس لئے پیارے شہیدؒ نے علم جغرافیہ کے حاصل کرنے میں بھی سعی بلیغ کی اور یہ خوشی سے دیکھا ہے کہ ہمارا واجب الاحترام شہیدؒ جغرافیہ میں کسی طرح قاصر نہ تھا" ۲؎ "سولہ سال کی عمر میں شاہ اسماعیلؒ نے قرآن و حدیث، تفسیر فقہ، فلسفہ، منطق، کلام، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کے علوم پر مکمل عبور حاصل کر لیا" ۳؎۔

ذہانت و طباعی

"یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ مولانا شہیدؒ نے کبھی کسی علم کے سیکھنے میں دوسرے طلباءؒ کی طرح محنت نہ کی۔ بلکہ جو کچھ استاد کے آگے پڑھا اسے پھر الٹ کر گھر میں نہیں دیکھا۔ اس ذہین اور چونچال تیز طبیعت پر بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے طباع طلبہ کئی صدی کے بعد پیدا ہوتے ہیں جن کو معمولی تعلیم آسمان فضل پر پہنچا دیتی ہے" ۴؎

مولانا رشید الدین خاںؒ جو شاہ عبدالعزیزؒ کے باکمال شاگرد تھے اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے "رشید المتکلمین" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے ان کا خیال تھا کہ شاہ صاحبؒ کو دینیات سے تو شغف ہے مگر معقولات میں کچھ زیادہ دستگاہ نہیں ہے یہ بات انہوں نے اپنے بعض شاگردوں سے بھی کہی تھی۔ اتفاقاً ایک روز شاہ صاحبؒ بیمار ہوئے۔ مولانا رشید الدین خان صاحبؒ اپنے شاگردوں کے ہمراہ احسن کی بیمار پرسی کیلئے تشریف لے گئے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا۔ "مولانا! آج بخار میں دماغ پریشان تھا اور اس پریشانی اور انتشار کی حالت میں فلسفہ کے فلاں فلاں مسائل کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور ان مسائل پر میرے دل میں یہ یہ اعتراضات پیدا ہوئے۔ مولانا رشید الدین خاںؒ بالکل ساکت رہے۔ واپسی پر ان کے تلامذہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو فرماتے تھے کہ مولانا اسماعیلؒ کو معقولات کی طرف کوئی توجہ نہیں، مولانا رشید الدین خاں نے جواب دیا:۔

"بیشک میں نے یہ کہا تھا مگر اب میری رائے ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی قبر

۱؎ اتحاف النبلاء باحیا ماثر الفقہاء المحدثین صفحہ ۴۱۷

۲؎ ایضاً صفحہ ۳۸ ۳؎ حیات شاہ اسمٰعیل شہیدؒ صفحہ ۴۴ - ۴؎ حیات طیبہ صفحہ ۳۹

سے نکل کر آ جائیں تو شاہ صاحب ؒ کے بیان کردہ اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے "۱۔

شاہ صاحب کی ورزشیں

"اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں جب ہمارے "قاطع بدعت" کا ظہور ہوا مسلمانوں کے اولو العزم ارادے مع ان کے اسلامی جوش و خروش کے خیرباد ہو گئے اور ان میں صرف عیش پرستی اور سستی رہ گئی تھی۔ گھوڑے پر چڑھنا' نیزہ بازی اور تلوار سے لیموں کاٹنا' میخیں اکھیڑنا' گولی چلانا' شیروں کے شکار کھیلنا غرض اس قسم کے سپاہیانہ کھیل جو سابق مسلمانوں کا روزمرہ کا زیور تھے' کبھی کے رفوچکر ہو گئے تھے اور ان کی جگہ تکیوں پر بھنگ گھوٹنے کے ڈنڈوں سے شب و روز سروکار تھا۔ بایں ہمہ پھر بھی مغلیہ سلطنت کا اثر کچھ نہ کچھ مسلمانوں کی طبائع میں باقی تھا اور ان کے جوش کی ٹھنڈی راکھ میں کبھی نہ کبھی پہلی چنگاری اپنی چمک دے جاتی تھی "۲۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ ؒ مدرسہ کے اوقات کے بعد اپنا زیادہ وقت فنون سپہ گری مثلاً تیراندازی' بندوق زنی اور شہ سواری سیکھنے پر صرف کرتے تھے۔ شاہ صاحب ؒ نے گھوڑے کی سواری دہلی کے مشہور چابک سوار میاں رحیم بخش سے سیکھی۔ سواری میں اس قدر مشق کی کہ "چاہے جیسا بھی چلبلا اور مونہہ زور گھوڑا ہو پھر بھی بے زین و رکاب اس پر سوار ہو کر دوڑا سکتے تھے۔ یہ بات قابل نوٹ ہے کہ مولانا چالیس چالیس میل کا چکر گھوڑے پر مار آتے تھے اور ذرا بھی تکان غالب نہ ہوتی تھی "۳۔ پٹے بازی مرزا رحمتہ اللہ بیگ سے سیکھی۔ مولانا کی ذہین طبیعت جیسی علم کی طرف راہنما تھی' ایسے ہی فنون کی طرف بھی مددگارانہ راہبری کرتی تھی۔ گولی لگانے میں مولانا نے اتنی مشق بڑھائی تھی کہ درخت پر سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو گولی سے گرا دیتے تھے۔ سپاہیانہ فنون سے فارغ ہو کر آپ ؒ نے تیراکی سیکھی۔ "بعض روایتوں کے بموجب تین برس اور بعض اقوال کے بموجب چار برس کامل مولانا پانی میں رہے "۴۔ شاہ صاحب نے ننگے پاؤں دوڑنے کی مشق کی حتیٰ کہ ایک سانس میں دس دس میل پیدل دوڑتے مگر تکان غالب نہ آتی۔ جھلستی ہوئی دھوپ اور تپتی ہوئی ریت پر آہستہ آہستہ برہنہ پا چلتے' پہلے پہل تو تلووں میں

۱۔ ارواح ثلاثہ صفحہ ۹۱ ۔ ۲۔ حیات طیبہ صفحہ ۴۱ ۔ ۳۔ ایضاً صفحہ ۴۳ ۔ ۴۔ ایضاً صفحہ ۴۵

چھالے پڑ گئے مگر آہستہ آہستہ ایسی عادت پڑ گئی کہ جامع مسجد دہلی کے سرخ پتھر پر گھنٹوں ٹہلتے رہتے۔ بھوک پیاس برداشت کرنے کا ایسا تجربہ اور ملکہ آپ نے حاصل کیا کہ تین چار روز بھی کھانے کو کچھ نہ ملتا تو اس فاقہ کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ "کم سونے میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا تھا اور ہمارے سوانح کا ناظر تعجب سے سنے گا کہ مولانا آٹھ آٹھ دس دس دن تک نہ سوتے تھے اور آپ نے آخر میں اتنی قوت بڑھائی تھی کہ جب چاہیں سو رہیں اور جب چاہیں جاگ اٹھیں۔" ا۔

کسی آدمی نے آپ سے پوچھا کہ قرآن مجید میں ہے " **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا** مگر آپ اپنے آپ کو اس مشقت کا عادی بناتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

" میں اپنی انسانی قوتوں کا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ودیعت ہوئی ہیں فطری قوتوں سے مقابلہ کر کے اندازہ لگاتا ہوں کہ آیا انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے ان سب پر غالب آسکتا ہے تو میں نے اس کا تجربہ کر لیا ہے کہ ہاں انسان چاہے تو اسے خاک، باد، آب، آتش مضرت نہیں پہنچا سکتی۔ ۲۔

گویا اس طرح شاہ صاحب نے پیہم اور مسلسل مشق کے ذریعہ عناصر اربعہ پر غلبہ پا لیا۔ سب سے بڑھ کر انہوں نے نفس کے گھوڑے پر اس طرح قابو پا لیا کہ آپ کی مرضی کے خلاف اسے کسی عمل کی حرکت نہ ہوتی تھی۔ شاہ صاحب نے عملی اور علمی اعتبار سے دونوں قسم کے ہتھیاروں سے آراستہ ہونے کے بعد جہاد زندگی میں قدم رکھا۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر　　شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

جہاد دو قسم کا تھا۔ " دعوت و ارشاد۔ کہ اسلامی معاشرے میں جو بدعات اور لغویات داخل ہو گئی تھیں انکے خلاف لسانی، قلمی اور علمی جہاد۔ دوسرا جہاد عبارت تھا۔ " جہاد بالسیف " سے۔ شاہ صاحب کا سونا دونوں کسوٹیوں پر کھرا ثابت ہوا۔ اس انجام کے لئے آباد شاہ پوری سے زیادہ خوبصورت الفاظ نہیں مل سکے۔ لکھتے ہیں:

" دھلی کے اس خاندان کے چشم و چراغ اور فرد فرید جو طلائے تاب دار ہمہ آفتاب

۱۔ ایضاً صفحہ ۴۸　　۲۔ حیات طیبہ صفحہ ۳۳

تھا، برصغیر میں ہی نہیں عرب و عجم میں بھی دور دور تک جس کے علم و فضل کا سکہ رواں تھا۔ بڑے بڑے علماء، صلحاء، مشائخ اور سلطنت کے اعیان و اکابر جس کے آستانے پر حاضری کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے، جس کا ہر فرد اپنی جگہ کتاب و سنت کا بحر بے پایاں تھا، جس کی طرف علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے سمرقند و بخارا اور ایران و عرب سے کھنچے چلے آتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، شاہ عبد العزیزؒ کے بھتیجے اور شاہ عبد الغنیؒ کے مایہ ناز فرزند، اپنے عظیم خانوادے کی عظیم روایات کے امین، حافظ قرآن و حدیث، معقول و منقول کے امام، زاھد و عابد، عالی ھمت، اولوالعزم، جری اور شجاع، ذہین و فطین، حسن عمل کے پیکر، غیرت حق کے مظہر، مصاف و سجادہ کے شہوار، دلوں کی کایا پلٹ دینے والے خطیب ان افراد میں سے ایک جنہیں مادر گیتی صدیوں میں جنم دیتی ہے۔

اپنے خاندان کے بزرگوں میں اس لحاظ سے امتیازی مقام رکھتے تھے کہ ان حضرات کا دائرہ عمل مدرسہ و خانقاہ میں بیٹھ کر کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و ارشاد تک محدود تھا۔ یہ صاحب عزیمت مرد حق اس دائرے سے باہر نکلے اور ہر اس مقام پر پہنچے جہاں کتاب و سنت کی تعلیمات اجنبی اور حق کی آواز بیگانہ تھی۔ جاہلیت کے اندھیرے طاری تھے۔ فسق و فجور کا بازار گرم تھا، مسلمان معاشرے میں دین کے نام پر مشرکانہ رسوم، بدعتیں اور ضلالتیں راہ پا چکی تھیں۔ انہیں یہ تصور شب و روز مضطرب اور بے چین رکھتا کہ قیامت کے روز معصیت، فسق و فجور اور شرک و بدعت میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے اگران کا دامن پکڑ لیا کہ اسماعیل تم نے کتاب و سنت کے نور سے بہرہ یاب ہونے کے باوجود ہمیں حق کا راستہ نہیں دکھایا اور اندھیروں میں بھٹکتے رہنے کے لئے چھوڑ دیا تو وہ کیا جواب دیں گے۔ یہی اضطراب انہیں ان مقامات اور گلی کوچوں میں بھی لے جاتا، مقدس اور پاکباز لوگ جن کے تصور ہی سے شرماتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے احکام کھول کر بیان کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا کرتے نہ کوئی خوف خطر دل میں لاتے۔ سید صاحب کی بیعت سے پہلے بھی علم و عمل کے میدان میں مقام بلند رکھتے تھے۔ ایک

اجتماعی تحریک کے ساتھ وابستگی سے گویا ان کی خداداد صلاحیتیں کندن بن کر چمک اٹھیں، وہ سراپا جدوجہد بن گئے۔ انہوں نے احیائے دین اور رد بدعات کے لئے دن رات ایک کر دئے۔ اللہ کی راہ میں جہاد اور خلق خدا کی ہدایت پر راحت و آرام کو قربان کر دیا۔ تبلیغی دوروں اور سفر حج و ہجرت میں ہزاروں بندگان خدا ان کے وعظ و ارشاد سے ہدایت یاب ہوئے۔ سید بادشاہؒ نے پرچم جہاد بلند کیا تو یہ مرد حق آخر دم تک صف اول میں رہے۔ وہ سید صاحبؒ کی جماعت حق پرست کا دماغ بھی تھے اور سپہ سالار بھی جنگ اور مصالحت کی گفتگو میں سید شہیدؒ کے مشیر خاص تھے۔ اکثر جنگی منصوبے انہیں کے ذہن رسا کا شاہکار ہوتے تھے۔ کئی جنگوں میں مجاہدین کی کمان کی۔ جنگ شنکیاری میں مختصر سی جمعیت کے ساتھ سکھوں کے بھاری لشکر کی صفیں الٹ دیں۔ جنگ مایار میں چار گنا فوج کو شکست دی۔ جنگ زیدہ میں مقابل فوج چودہ گنا تھی، لیکن انہوں نے ایسا جنگی منصوبہ بنایا کہ اسے شکست فاش ہوئی۔ کمزور سے قالب میں ایسی توانا اور شجاع روح تھی کہ لوگ ہیبت کھاتے۔ ایک مرتبہ ایک درانی سپاہی نے کسی خاتون کا مال چھیننے کی کوشش کی۔ اس نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں جم کر کھڑے رہتے، نہ تو میدان سے ہٹے اور نہ مورچے میں پناہ لیتے اور اس آخری جنگ (بالا کوٹ ۶ مئی ۱۸۳۱ء ر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) میں بھی وہ کھلے میدان میں پڑے ہیں۔ گولی ان کی پیشانی میں لگی ہے جس سے ان کا نورانی چہرہ گل رنگ ہو گیا۔ وہ ست بنے نالے کے پار شاہ اسماعیلؒ اپنے لہو میں نہائے حیات جاوداں سے ہمکنار، للیت، فداکاری و بے نفسی اور حمیت اسلامی کے ایسے نقوش جمیل ثبت کئے پڑے ہیں جو دعوت و عزیمت کی تاریخ میں شب تاب ہیروں کی طرح ہمیشہ چمکتے دمکتے رہیں گے"۔ ۱

شاعر نے سچ کہا ہے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

جماعت مجاہدین کا پہلا دور

۶ مئی ۱۸۳۱ء (ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ) سید احمد شہیدؒ اور انکے دست راست شاہ اسماعیلؒ

---

۱۰۱ سید بادشاہ کا قافلہ

کی شہادت پر جماعت مجاہدین کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے۔ میرے ذاتی نکتہ نظر کے مطابق پہلے دور کا نکتہ آغاز تقریباً ۱۸۰۷ء ر ۱۲۲۲ھ میں ہوا جب سید احمد شہیدؒ نے شاہ عبد العزیزؒ کی بیعت کی اور پھر مولانا عبد الحیؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنگ بالا کوٹ میں نہ صرف امیر جماعت اور ان کے دست راست شاہ اسماعیلؒ شہید ہوئے بلکہ ایک سو چوالیس ایسے نفوس قدسیہ شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لئے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لئے شرف و عزت اور خیرو برکت کا باعث تھے۔ مردانگی و جوانمردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس و تقوی اتباع سنت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا اس جیسا "عطر مجموعہ" صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا۔"[1]

۔ کتنے پیارے اور عظیم لوگ امت نے ان کوھساروں اور وادیوں میں کھو دئے ہیں تاریخ کا مسافر سوچتا ہے اور جو باقی رہ گئے ہیں زخموں سے چور اور شکستہ امید لوگ جانے انہیں کب تک ان پہاڑوں میں سرگرداں پھرنا پڑے گا۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر (۳۳:۲۳)

(اہل ایمان میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جس بات کا عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ پھر ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے عہد شہادت کو پورا کر دکھایا اور کچھ اس کے منتظر ہیں) کی عملی تفسیر کے بعد سید صاحب کے رفقاء اور مجاہدین کے لئے یہ انتہائی صدمے کا وقت تھا۔ اس تتر بتر قافلے کا کوئی رہنما نہ تھا۔

شیخ ولی محمد پھلتیؒ

۱۸۳۱ء۔ ۱۸۴۰ء

شیخ ولی محمد پھلتیؒ حضرت کے غم فراق سے ہوش و حواس کھو بیٹھے سب کی باتیں سنتے کسی کا جواب نہ دیتے۔ شیخ حسن علیؒ، مولوی محمد قاسم پانی پتیؒ اور مولوی نصیر الدین منگلوریؒ

[1] ۔ سیرت سید احمد شہیدؒ ج د صفحہ ۴۵۹

کے بے حد اصرار پر کہ جماعتی نظم و نسق کا تقاضا ہے کہ آپ منصب امارت سنبھالیں" ۱ ۔' شیخ ولی محمدؒ امارت کی گراں قدر ذمہ داریاں اٹھانے کیلئے تیار ہو گئے ۔ آخر سرکردہ احباب کے مشورے سے باقاعدہ بیعت کا انتظام کیا گیا۔ شیخ ولی محمدؒ صاحب نے مولوی محمد قاسم پانی پتی کو امیر جہاد مقرر کیا ۔ شیخ ولی محمدؒ کا اپنا مشن سید احمد شہیدؒ کی زوجہ محترمہ کو سندھ پہنچانا تھا ' اس لئے انہوں نے اپنے پاس صرف بیس بائیس آدمی رکھے باقی سب احباب جماعت کو کوہانہ روانہ کر دیا ۔

مرکز ستھانہ

سادات ستھانہ کے سوا سرحد کے اکثر خوانین اور پیرزادے صرف نمودو نمائش کے پرستار تھے ۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ان کے دلوں میں کوئی مخلصانہ جذبہ موجزن نہ تھا ۔ مجاہدین کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ کوئی دوسرا مرکز (مامن) تلاش کریں صرف ستھانہ ' چملہ اور بونیر کے سادات کا دامن غرض پرستی کے لوث سے پاک رہا۔ اسی لئے مجاہدین نے اسے مستقل مرکز بنا لیا۔

ڈاکٹر بیلیو (Bellew) کے مطابق مجاہدین تین سال تک بہ اطمینان ستھانہ میں مقیم رہے ۔ ۱۸۳۸ء تک مجاہدین کے سپہ سالاری کا منصب مولانا نصیرالدین منگلوری کو حاصل رہا ۔ مجاہدین کے امیر شیخ ولی محمد پھلتی تھے ۔ اب مجاہدین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں درویشوں کے بھیس میں ہندوستان سے ستھانہ پہنچ رہی تھیں ۔ "منارہ" جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے وہاں کے باشندوں نے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت کو لوٹ لیا ۔ مولانا نصیرالدینؒ مجاہدین کی حمایت میں نکلے مگر فتح خان پنجتاری جو مجاہدین کا دشمن تھا اس نے آپ کو زہر دلوا دیا ۲۔ یا اپنے آدمیوں کے ہاتھوں شہید کروا دیا ۔"۳۔ مولوی نصیرالدینؒ کی شہادت سے سرحد میں مجاہدین کا کاروبار جہاد عملاً درہم برہم ہو گیا اگرچہ جماعت اس کے بعد بھی باقی رہی مولانا نصیرالدین منگلوریؒ پیکر ایثار تھے مگر ان کے فکر و خیال کا دامن کسی دنیوی غرض سے آلودہ نہ ہوا ۔ مولانا کی شہادت کے ساتھ ہی "جماعت مجاہدین" کا پہلا دور (۱۸۰۷ء تا ۱۸۴۱ء) تمام ہوا ۔

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۰۰ ۲۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور (ن جاکھی) صفحہ ۳۲
۳۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۱۹

دوسرا دور

مولانا نصیرالدین منگلوری ؒ کی شہادت کے بعد جو مجاہدین ستھانہ میں مقیم تھے انہوں نے میر اولاد علی کو اپنا امیر بنا لیا۔ جماعت کے دوسرے دور کا آغاز مولانا سید نصیرالدین دہلوی ؒ کی اقامت جہاد سے شروع ہوتا ہے لیکن مولانا نصیرالدین منگلوری ؒ کے بعد آٹھ نو سال تک سرحد میں کوئی قابل ذکر سلسلہ جہاد شروع نہ ہو سکا، مگر سید صاحب ؒ کی جاری کردہ اس تحریک کا چراغ بدستور روشن رہا۔

سید نصیرالدین ؒ دہلوی

فروری ۱۸۴۰ء تا ستمبر ۱۸۴۰ء

آپ شاہ رفیع الدین ؒ کے نواسے تھے۔ والدہ کا نام امتہ اللہ تھا۔ سید صاحب ؒ کی تحریک جہاد کے کارفرماؤں کو جب ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کر کے آزاد علاقے میں بھیج دی جائے جس سے سید صاحب کے کام (جہاد) میں جوش و خروش کی نئی روح پیدا ہو جائے۔ اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روز اول سے مولوی سید نصیرالدین ؒ دہلوی کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ جنہوں نے سید صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ دعوت جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سید صاحب کی طرح وطن مالوف سے ہجرت کر کے کاروبار جہاد کی تجدید کی "۔۱

یہ ہجرت ۳ فروری ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ کو اختیار کی براستہ جے پور، ٹونک، اجمیر، جودھ پور، جیسلمیر سے ہوتے ہوئے سندھ کو جہاد کا مرکز بنایا۔ سندھ میں آپ کی پہلی منزل پیر کوٹ (پیر جو گوٹھ۔ جو سادات کے اس خاندان کا مرکز چلا آتا ہے جو "پیر پگاڑو" کے لقب سے شہرت پذیر ہوا) ۲۔ سید احمد شہید ؒ کے اہل و عیال بھی پیر صبغت اللہ صاحب ؒ کے پاس کئی سال رہے اس وجہ سے غالباً سید نصیرالدین صاحب ؒ نے "پیر کوٹ" کو اپنی پہلی منزل قرار دیا۔ اس کے بعد حیدر آباد (سندھ) کا دورہ کیا اسی دوران (۱۸۳۷ء ر ۱۳۵۲ھ) بہت سے مجاہدین حیدر آباد دکن سے حیدر آباد سندھ پہنچے۔ سید احمد شہید ؒ کے بہت سے نقیب جا بجا دعوت و ارشاد پر متعین تھے۔ حیدر آباد دکن میں مولانا ولایت علی ؒ عظیم آبادی ؒ، ان کے بھائی مولانا عنایت علی ؒ مشرقی بنگال میں، مولانا سید محمد علی رام پوری

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۲۹ ۲۔ ایضاً صفحہ ۱۵۰،۵۱

مدراس میں وعظ و نصیحت پر مامور تھے اور مولانا سید اولاد حسن قنوج کے گردو نواح میں یہ فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ان تمام علاقوں سے سمٹ کر مجاہدین سندھ میں وارد ہوئے۔ ڈیرہ غازی خان کے علاقوں میں سکھوں سے برسرپیکار رہے۔ بلوچستان کے راستے افغانستان پہنچے۔ انگریز افغانستان کی آزادی سلب کرنے پر تل گئے' امیر دوست محمد نے مقابلے کی ٹھانی۔ مولوی نصیرالدین صاحب نے دوست محمد کی اعانت کا فیصلہ کرلیا۔ غزنی میں انگریزوں سے بڑا گھمسان کا رن پڑا مگر امیر دوست محمد کے ایک عزیز عبدالرشید خان کی غداری سے مولوی سید نصیرالدینؒ کے اکثر ساتھی مقام شہادت پر سرفراز ہوئے۔ یہ ۲۱ جولائی ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے۔ بروایات غزنی میں تین سو مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ ۱ یا ایک ہزار شہید ہوئے۔ اوکنلے کے بیان کے مطابق "مولوی نصیرالدین نے دوست محمد کی امداد کا فیصلہ کرلیا۔ بعض اصحاب اس پر تیار نہ تھے اور وہ لوٹ آئے۔ خود مولوی صاحب ایک ہزار آدمی لے کر کابل کی طرف بڑھے ڈھاؤر سے انہوں نے تین سو مجاہدوں کی جمعیت دوست محمد خاں کی امداد کے لئے بھیج دی۔ یہ لوگ غزنی کی حفاظت پر متعین تھے اور وہیں جاں بحق ہوئے

سید احمد شہیدؒ کے جانشین سید نصیرالدین دہلویؒ ایک دفعہ پھر اپنے احباب کی قربانیوں کے بعد ستھانہ پہنچے۔ غالبًا ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء کے اوائل کی بات ہے مولانا نصیر الدینؒ منگلوری کی شہادت کے بعد ستھانہ میں ستراسی مجاہدین موجود تھے جن کا انتظام میر اولاد علی عظیم آبادیؒ نے سنبھال رکھا تھا۔ مولوی سید نصیرالدینؒ ستھانہ پہنچے تو انہیں امیر بنا لیا گیا۔ ابھی کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے پائے تھے کہ اللہ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ ۱۸۴۰ء ستھانہ میں دفن ہوئے قبر ۱۸۴۱ء کی طغیانی دریائے سندھ میں بہہ گئی۔

؎ نیک ناموں کے نشاں باقی رہیں گے حشر تک کیا ہوا گر دور گردوں نے مٹا دی قبر تک

بقول نواب وزیر الدولہ "سید نصیرالدین دہلویؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ سید صاحب (احمد شہیدؒ) کے بعد خلق خدا کی ہدایت' شریعت کے احیاء اور جہاد کا کاروبار بے آب و تاب ہو رہا تھا۔ خدا کی رحمت سے مولوی سید نصیرالدینؒ کی بدولت اس کاروبار میں بے اندازہ رونق اور جلا پیدا ہو گئی"۔ ۲

۱۔ ہندوستانی مسلمان (انگلش) صفحہ ۱۳ (ولیم ہنٹر) ۲۔ وزیر الدولہ کے وصایا ج ۱ صفحہ ۲

سید عبد الرحیمؒ

ستمبر ۱۸۴۰ء تا جون ۱۸۴۱ء

" بتایا جاتا ہے کہ مولوی سید نصیرالدینؒ کی وفات کے بعد حاجی سید عبد الرحیمؒ جماعت مجاہدین کے امیر بنے پھر دریائے سندھ میں طغیانی آئی جس میں ستھانہ برباد ہو گیا" ۔ ۱۔ مولانا مشتاق احمد صاحب انیٹھوی نے ایک سید عبد الرحیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کا اصلی وطن افغانستان تھا۔ سید احمد شہیدؒ سے بیعت کی۔ انہیں کے ساتھ جہاد کے لئے چلے گئے اور شہادت پائی۔ ممکن ہے یہی سید عبد الرحیمؒ ولایتی ہوں جو مولوی نصیر الدینؒ کی وفات پر مجاہدین کے امیر بنے' میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ۔ ۲

تیتو میاںؒ

" جماعت مجاہدین " کے تیسرے دور کے آغاز سے پیشتر تیتو میاںؒ (نثار علی) کا ضمناً ذکر ضروری ہے نثار علی عرف تیتو میاں ایک خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ایک زمیندار سے جھگڑا ہوا۔ جیل کی سزا ہوئی۔ قید سے رہا ہو کر حج بیت اللہ کے لئے چلا گیا۔ سید احمد شہیدؒ سے مکہ مکرمہ میں ملاقات اور بیعت ہوئی۔ ۱۸۲۷ء میں وطن لوٹ کر بنگال میں خدمت دین کے جذبہ سے سرشار نکل کھڑا ہوا۔ تیتومیاں کی اصلاحی تحریک رنگ لائی۔ لوگوں نے داڑھیاں رکھنی شروع کردیں ایک ہندو زمیندار کشن رائے اسے برداشت نہ کر سکا اس نے ہر داڑھی رکھنے والے مسلمان پر اڑھائی روپے فی کس " داڑھی ٹیکس " لگا دیا۔ ہنٹر نے لکھا ہے: کشن رائے نے جو اچھامتی ندی کے کنارے کا بہت بڑا زمیندار تھا پانچ شلنگ کا ٹیکس ہر اس کسان پر لگا دیا تھا جو تیتو میر کی اصلاحی تحریک میں شامل ہوتا تھا" ۔ ۳ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجبوراً مسلمانوں کو تیتو میر کی سرگردگی میں سید احمد شہیدؒ کا مشن اپنانا پڑا ہندوؤں سے جھڑپیں ہوئیں۔ مسلمان اس میں کامیاب و کامران ہوئے۔ آخر کلکتہ سے ایک بڑی فوج آئی جس میں سوار بھی تھے پیادہ بھی تیتو میرؒ نے سخت مقابلہ کیا ان کے بہت سے ساتھی اور جانباز بھی شہید ہوئے۔ " خود تیتو میاںؒ نے شہادت پائی تیتو میاں کے دل میں یہ جذبہ دراصل سید صاحب کی

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۹۹ ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۰۰-۱۹۹ ۳۔ ہمارے ہندی مسلمان (حاشیہ ۳۷)

تربیت سے پیدا ہوا تھا۔ یہ قومی زندگی کا روشن نشان تھا۔" ؎ ۱

(خاندان صادق پور عظیم آباد (پٹنہ) (مراکز: پنجتار' ستھانہ' منگل تھانہ)

تیسرا دور ۱۸۴۱ء تا ۱۸۵۹ء

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سید صاحب" کے مقرر فرمائے نقیب جا بجا دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ جن میں سے مولانا ولایت علی عظیم آبادی پہلے حیدر آباد (دکن) میں کام کر رہے تھے سید صاحب کی شہادت کے بعد اپنے وطن پہنچ گئے۔ ان کے بھائی مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں سرگرم عمل تھے۔ مولانا سید محمد علی رام پوری مدراس میں وعظ و نصیحت کے مراکز قائم کرنے کے بعد ملک کے دوسروں حصوں میں مشغول تھے۔ مولانا ولایت علی" کو اللہ نے دعوت و ارشاد کا عظیم ملکہ عطا فرمایا تھا جہاں بھی گئے "گرد و پیش سنت کا احیا کر دیا اور بدعتیں بالکل محو کر ڈالیں۔ مثلاً تمام لوگ کتاب و سنت کے پابند ہو گئے بری رسمیں مٹ گئیں۔ نکاح بیوگاں کا اجراء ہوا۔ اپنے دو بیٹوں کا نکاح دو بھتیجیوں سے اس سادگی کے ساتھ کر دیا کہ کسی کے لئے کوئی نیا جوڑا تیار نہ کرایا سب نے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے جن میں پیوند لگے ہوئے تھے۔" ؎ ۲

ایک وہ وقت تھا کہ نازو نعم کا پروردہ ولایت علی ایسی سادگی اور جفاکشی سے ناآشنا تھا "سید بادشاہ کا قافلہ کے مصنف نے لکھا ہے "مولانا ولایت علی چاندی کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے اور نازو نعم اور جاہ و ثروت کے گھورائے میں جھول کر پروان چڑھے۔ نانا کے بڑے چہیتے تھے۔ نعمتوں کی فراوانی اور لاڈ پیار نے ان کے اندر وہ ساری خوبو پیدا کر دی تھی جو طبقہ رؤسا کے بچوں کی خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ بے حد ذہین وذکی' خوش پوشاک اور شوقین مزاج تھے۔ تعلیم کے ابتدائی مدراج سے فارغ ہو کر تکمیل کے لئے لکھنؤ پہنچے تو وہاں مترفانہ اور عشرت پرور فضا میں ان کا یہ رنگ اور شوخ ہو گیا۔ بدن پر اعلیٰ قسم کی زر بفت و زردوز پوشاک' آنکھوں میں سرمہ' دانتوں میں مسی۔ ہاتھوں پر رنگ حنا' گیسو آھن تاب پشت پر پڑے ہوئے' انگلیوں میں طلائی انگوٹھیاں اور چھلے' پاؤں میں زردوز جوتی۔ جسم اور لباس ہر وقت خوشبویات میں بسا ہوا۔ غرض اپنے دور

۱؎ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۰۹ ۲؎ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۸

کے پورے پورے فیشن ایبل نوجوان تھے"۔ ا

اب ذرا سید صاحب کی صحبت کے فیض کا نقشہ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

مولانا گھر بار چھوڑ کر نکلے تو چند روز کے اندر اندر زندگی کا پرانا خول ٹوٹ پھوٹ گیا ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں " معصب بن عمیرؓ کی طرح حالت یکسر بدل گئی ۔ اب آپ عظیم آباد اور لکھنؤ کے بانکے نہ تھے سید صاحبؒ کی جماعت کے ایک جفا کش مزدور اور معمولی خادم تھے ۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور سر پر لاد کر لاتے ' اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے ۔ مٹی گارے کا کام کرتے زہد و ریاض اور مشقت کی زندگی نے یہ حالت کر دی کہ پہچانے نہ جاتے ۔ ایک مرتبہ والد گرامی نے بچپن کے خدمتگار کو چار سو روپے نقد اور پیش بہا ملبوسات اور دوسرا سامان دے کر رائے بریلی بھیجا سید صاحب کے قافلے میں پہنچ کر اس نے آپ کو دریافت کیا ۔ لوگوں نے بتایا دریا کے کنارے مٹی گارے کا کام کر رہے ہیں ۔ وہ کنار دریا پہنچا وہاں بہت سے لوگ مسجد اور قافلے کے مکان تعمیر کرنے میں مصروف تھے ۔ مولانا بھی موٹا سا سیاہ تہمد پہنے گارے میں لتھڑے مصروف کار تھے صورت شکل ایسی بدل چکی تھی کہ وہ پہچان نہ سکا ۔ انہی سے پوچھا " مولوی ولایت علی پٹنہ والے کہاں ہیں ؟ آپ نے جواب دیا " بھائی ولایت علی تو میرا نام ہے " خدمتگار سمجھا یہ شخص تمسخر کر رہا ہے ۔ بڑے غصے میں کہا میں تم کو نہیں پوچھتا ولایت علی صاد قپوری کو پوچھتا ہوں جو مولوی فتح علی کے صاحبزادے اور رفیع الدین حسین خاں کے لاڈلے نواسے ہیں ۔ آپ نے فرمایا " بھائی صاد قپوری ولایت علی تو میں ہی ہوں " اس نے کہا مجھ سے مذاق کرتے ہو فرمایا ۔ پھر جاؤ قافلے والوں سے پتہ کر لو وہ قافلے میں واپس آیا تو لوگوں نے یقین دلایا کہ ولایت علی عظیم آبادی وہی ہیں جن سے تم دریا کنارے مل کر آئے ہو ' چنانچہ وہ نادم و پشیمان آپ کے پاس آیا ور اپنی جسارت پر معافی چاہی ۔ پھر سامان اور روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ۔ مولانا ولایت علی نے سب چیزیں لیں ۔ انہیں کھول کر بھی نہ دیکھا ۔ اسی طرح بندھی بندھائی لے جا کر سید صاحبؒ کے قدموں میں رکھ دیں اور چپ چاپ چلے آئے ۔

سید بادشاہ کے لکھنؤ آنے کا جب غلغلہ بلند ہوا تو مولانا ولایت علی ۲۴ برس کے تھے

ا ۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۰۷۔ ۱۰۸

اور معقولات کے ماہر مولانا محمد اشرف فرنگی محلی کے حلقہ درس میں شامل تھے ۔ سید صاحب" کا چرچا پہلے ہی پھیل چکا تھا ۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے داعی تھے جس نے زندگیوں کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اس جمود کو توڑ ڈالا تھا جو علماء کی بے عملی ' مداہنت اور مصلحت کوشی ' سیاسی زوال اور اخلاقی و فکری انحطاط کی بدولت امت پر طاری تھے ۔ لوگوں نے سن رکھا تھا کہ سید صاحب" جہاں جاتے ہیں زندگیاں بدل جاتی ہیں ' دینی حمیت و غیرت کا جوہر چمک اٹھتا ہے ' عبادت الٰہی کا ذوق و شوق اور خشیت الٰہی کا درد و سوز پیدا ہو جاتا ہے ' شراب کی دوکانیں بند ہو جاتی ہیں اور مسجدیں آباد ۔ فسق و فجور میں غرق انسان زاہد و متقی بن جاتے ہیں ' شرک و بدعت کے اعمال چھٹ جاتے ہیں اور دل و دماغ توحید و سنت کے نور سے منور ہو جاتے ہیں ۔ ١

جب سید بادشاہ لکھنؤ میں وارد ہوئے تو ایک دنیا ان کی مجالس اور وعظوں میں امڈ آئی ۔ ایک روز مولانا محمد اشرف صاحب نے اپنے عزیز شاگرد ولایت علی کو پیغام دے کر بھیجا اور سید صاحب" سے تخلیہ میں ملنے کی درخواست کی وہ جاننا چاہتے تھے کہ رائے بریلی کے اس سید" میں ایسی کیا بات ہے کہ ولی اللہ خاندان تک ان کی عقیدت اور ارادت کا دم بھرتا ہے اور اسی خاندان کے دو عظیم فرزند ان کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں اور ایسے حلقہ بگوش کہ اپنے پیرو مرشد کی رکاب تھام کر چلتے اور راتیں ان کے دائیں بائیں بیٹھے جاگ کر کاٹ دیتے ہیں ۔ حالانکہ یہ خاندان خود علم و کمالات کی ان بلندیوں پر فائز ہے کہ بڑے بڑے اہل علم و مشائخ اس کے آستانے پر حاضری کو سعادت سمجھتے ہیں ۔ سید بادشاہ" نے کہلوا بھیجا " بڑی خوشی سے تشریف لائیے ' فقیر دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہے " اگلے روز وقت معین پر استاد اور شاگرد دونوں حاضر ہوئے مولانا محمد اشرف صاحب نے مزاج پرسی کے بعد " **وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین** " کی تشریح چاہی سید صاحب نے کوئی دو گھنٹے ایسے موثر انداز میں وضاحت فرمائی اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت کا مقصد بیان کیا کہ دونوں حضرات پر پہلی بار آشکارا ہوا کہ وہ اب تک منطق و فلسفہ کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہے ۔ یہ تو دنیا ہی اور ہے ۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور جب وہ اس بابرکت مجلس سے رخصت ہوئے تو سید بادشاہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے

١ ۔ ایضاً صفحہ ١٠٧

چکے تھے۔ مولانا ولایت علی کی دنیائے فکر و نظر تو اسی روز تبدیل ہو گئی لیکن عمل کی دنیا میں انقلاب اس وقت آیا جب سید بادشاہؒ حج کر کے واپس آئے۔ مولانا ولایت علیؒ اپنے دونوں بھائیوں، مولانا عنایت علی اور طالب علی اور خاندان کے کئی افراد کو لے کر اپنے پیرو مرشد کا استقبال کرنے پاپیادہ مونگیر پہنچے۔ قافلہ پٹنے پہنچا تو خاندان کے بڑوں نے باری باری سید صاحبؒ کی ضیافت کی اور خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد نے بیعت کی پھر " عورتوں اور بچوں سمیت پورا گھرانہ دعوت حق میں ایسا رنگا کہ برصغیر کا کوئی گھرانہ اس باب میں اس کا ہمسر نہ تھا۔ سکھوں کے ساتھ پہلی جنگ میں جو پہلا شخص راہ خدا میں شہید ہوا، وہ اسی خاندان کا ایک نوجوان مولانا ولایت علی کا چچیرا بھائی۔۔۔ باقر علی تھا اور پھر تو کم و بیش ایک صدی یہ خاندان تحریک دعوت و جہاد میں اپنی قربانیوں سے رنگ بھرتا رہا اور راہ حق و صدق میں عشق و اخلاص کی ایسی تابناک مثالیں قائم کرتا رہا جن سے دعوت و عزیمت کی تاریخ کے اوراق ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے"۔ ۱

علم و فضل

مولانا ولایت علیؒ کا علم و فضل میں مقام بہت اونچا ہے۔ سید نذیر حسینؒ (شیخ الکل) جیسے نابغہ آپ کے وعظ سے متاثر ہوئے اور اپنی زندگی خدمت دین کے لئے وقف کر دی۔ شیخ عبد اللہ سراج محدث سے (عرب میں) حدیث کی سند حاصل کی شیخ فرماتے تھے " مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی "۔ ۲ آپ نے نجد عیسرا اور یمن کی بھی سیر کی اور غالباً صنعاء میں قاضی محمد بن علی شوکانیؒ سے سند حدیث حاصل کی "۔ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں " مولوی ولایت علی قنوج تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدہ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب " بلوغ المرام " ضرور پڑھنا، میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا..... جو اثر سریع میں نے وعظ مولوی ولایت علی مرحوم میں پایا کسی کے وعظ میں نہ دیکھا نہ سنا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے بالکل سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہ دل سے اٹھتا تھا

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۰۹-۱۰۸ ۲۔ تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۲۲ ۳۔ ابقاء المنن صفحہ ۱۲

مولانا عنایت علیؒ

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مولانا ولایت علیؒ حیدر آباد دکن سے وطن (صادق آباد) واپس لوٹ آئے۔ شہادت کے بعد کے دگرگوں حالات کا جائزہ لینے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی صاحبؒ کو سرحد بھیجا۔ ۱۸۴۱ء میں مولانا عنایت علی سرحد پہنچے مجاہدین نے انکی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں امیر المجاہدین مقرر کر دیا۔ انہی دنوں رنجیت سنگھ کے مرنے کی وجہ سے سکھوں کی حالت ابتر تھی۔ دو سال کی متواتر کوشش سے مولانا عنایت علی صاحبؒ نے کاغان کے سادات خاندان کے تعاون سے بالا کوٹ فتح کر لیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے مولانا عنایت علی صاحبؒ نے گڑھی حبیب اللہ، فتح گڑھ، دمتوڑ، اورش، تنول کا علاقہ ہزارہ بھی فتح کر لیا۔ اوکنلے کے بیان کے مطابق "مظفر آباد میں سکھوں نے شکست کھانے کے بعد مانسہرہ میں قدم جمانے کی کوشش کی لیکن دوبارہ شکست کھائی۔ غرض مجاہدین نے تھوڑے ہی وقت میں دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہری پور سے کاغان تک اور ستھانہ سے کشمیر تک قبضہ جما لیا"۱

"مولانا عنایت علیؒ نے فتح گڑھ کا نام بدل کر "اسلام گڑھ" رکھ دیا۔ اسے اپنا مرکز بنایا۔ یہاں پھر سے قرآن و سنت کا نظام حدود و تعزیرات نافذ کیا۔ ہر شخص پر لازم تھا کہ نماز با جماعت ادا کرے جو شخص شرعی عذر کے بغیر کوتاہی کا مرتکب ہوتا اس سے جرمانہ لیا جاتا۔ عوام سے پانچ سیر غلہ اور امیروں سے ایک روپیہ فی کس۔"۲

مولانا ولایت علیؒ کی امارت

۱۲۶۲ھ ۱۲۶۹ھ

۱۸۴۶ء ۱۸۸۲ء

ان حالات میں مولانا ولایت علیؒ اچانک ۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء (۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ) مانسہرہ پہنچے۔ مولانا عنایت علیؒ نے اپنے بڑے بھائی کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۶ء (۲۴ شوال ۱۲۶۲ھ) بالا کوٹ پہنچ کر مولانا عنایت علیؒ نے امارت کا پورا کاروبار مولانا ولایت علیؒ کے حوالے کر دیا۔ "غرض مولانا (ولایت علیؒ) کے وہاں پہنچتے ہی کل کارخانہ

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۳۱ (بحوالہ کلکتہ ریویو صفحہ ۳۸۲) ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۳۶

مولوی عنایت علیؒ صاحب نے آپ کے سپرد کر دیا اور جملہ مجاہدین نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت امارت کر لی"۔ ۱

مولانا ولایت علیؒ کی امارت کو ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے کہ خوانین کی غداری کی وجہ سے سکھوں اور انگریزوں کی فوجوں نے مل کر مظفر آباد اور گڑھی حبیب اللہ پر دونوں طرف سے حملہ کر دیا۔ دب پر گھمسان کا رن پڑا۔ مجاہدین کے مراکز تباہ ہو گئے جنگ دب (آجکل دب ہزارہ اور ضلع مظفر آباد کی درمیانی حد پر واقع ہے) نے پھر مجاہدین کے شیرازہ کر منتشر کر دیا۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ لاہور ہوتے ہوئے اپنے وطن عظیم آباد چلے گئے انگریزوں نے دونوں بھائیوں کو دس دس ہزار کے مچلکے داخل کرانے اور دو سال تک نظربند رہنے کا حکم دیا۔ نظربندی ختم ہوتے ہی مولانا ولایت علیؒ نے وطن مالوف سے مستقل ہجرت اختیار کی۔ سرحد سے ہوتے ہوئے مرکز ستھانہ پہنچے۔ جہاد فی سبیل اللہ میں اگرچہ کوئی کارنامہ اب سرانجام نہ دے پائے تھے کہ قضا کا بلاوا آ گیا اور بہ عارضہ خناق ۵ نومبر ۱۸۸۲ء (۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ) راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ستھانہ کے قبرستان میں دفن ہوئے ۔۔۔ یہ جو فرمایا تھا کہ ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے' سو اس عہد کو وفا کر دیا۔

ولایت علی رہبر دین حق — بہ ماہ محرم چو شد زیر خاک
بگو از سر آہ سال وفات — شدہ جاء سیرش بہ فردوس پاک

وہ ولایت علیؒ جو دین حق کا راہبر تھا جو ماہ محرم میں قبر کے نیچے چلا گیا۔ "آہ" کے سرسے اس کی وفات کا سال کہو۔ اس کی سیر کی جگہ جنت بن گئی ہے۔

مولانا عنایت علیؒ کی امارت

۱۲۶۹ھ ۱۲۷۴ھ

۱۸۵۲ء ۱۸۵۸ء

مولانا ولایت علیؒ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل دونوں جلیل القدر بھائیوں میں کچھ اختلاف ہو گیا تھا جس وجہ سے مولانا عنایت علی منگل تھانہ چلے گئے تھے۔ بھائی کی وفات

۱۔ تذکرۂ صادقہ صفحہ ۱۲۳

کے بعد مرکز ستھانہ تشریف لائے۔ سب نے آپ کو بالاتفاق اپنا امیر تسلیم کر لیا۔

مولانا عنایت علیؒ کی بقیہ زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد میں گزر گیا۔ کوہ سیاہ (مقامی نام : کالا ڈھاکا) کی معرکہ آرائی ' امب پر مجاہدین اسلام کا شبخون ' ایسی بہت سی لڑائیاں مولانا صاحب کی امارت میں لڑی گئیں ' انگریزوں کی ایک بڑی فوج نے مرکز ستھانہ کو توپوں سے اڑا دیا ' جس پر مولانا عنایت علیؒ کو چاروناچار دوبارہ منگل تھانہ کو پھر مرکز بنانا پڑا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی

شاعر نے سچ کہا تھا:

؎ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

یہ کارنامہ بھی جماعت مجاہدین کی قسمت میں لکھا تھا اور مولانا عنایت علیؒ کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ انگریزوں نے اسے ۱۸۵۷ء کا غدر قرار دیا مگر آزادی کے بعد مورخین نے اسے "تحریک آزادی ہند کا پہلا قدم" قرار دیا۔ مولانا عنایت علیؒ اس بات کو بھانپ گئے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مقابلہ میں انہیں جن سپاہیوں سے زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہندوستانی یا ہندی مسلمان ہی ہیں۔ مولانا عنایت علیؒ نے انگریزی فوجوں میں دعوت جہاد کا انتظام کر دیا تھا۔ ریون شا- (Raven shaw) کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں پنجاب کے ارباب اختیار کو باغیانہ خط و کتابت کا سراغ ملا اور معلوم ہوا کہ دیسی پیادہ فوج کی چوتھی رجمنٹ مقیم راولپنڈی کو راہ وفا سے منحرف کرنے کی کوشش کی گئی۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ تحریک بغاوت کا اصل مرکز عظیم آباد کا محلہ صادق پور تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ رپورٹ دیکھ کر تاکید کی کہ اہل صادق پور کی سرگرمیوں کو بہ طور خاص زیر نگرانی رکھا جائے۔ کچھ مدت بعد اسی رجمنٹ کے منشی محمد ولی پر مقدمہ چلا ۱۲ مئی ۱۸۵۳ء کو جرم ثابت ہو گیا۔"[1]

"نمبر ۵۵ پیادہ فوج (نیٹو انفنٹری) مردان میں مقیم تھی اور اس کا ایک حصہ نوشہرہ چھاؤنی میں متعین تھا۔ ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو نوشہرہ والا حصہ سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ آدھی رات کو یہ اطلاع پشاور پہنچی جہاں مشہور انگریز "ہربرٹ ایڈورڈز" اور جان نکلسن موجود

۱؎ ہمارے ہندی مسلمان صفحہ ۱۴

تھے۔ انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ خبر مردان پہنچتے ہی نمبر ۵۵ پوری کی پوری سرکشی اختیار کرے گی اور نمبر ۱۰ رسالے سے بھی اطمینان سے بیٹھے رہنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے صبح ہوتے ہی پشاور کی فوج سے ہتھیار لے لئے اور ۲۳ مئی کو رات کے وقت کرنل چیوٹ ایک فوج کے ساتھ مردان روانہ ہو گیا۔ نمبر ۵۵ کو پشاور سے فوج کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ مقابلے کیلئے تیار ہو گئے۔ سخت جنگ ہوئی جس سے نمبر ۵۵ کے ایک سو بیس افراد مارے گئے۔ ڈیڑھ سو کے قریب زخمی ہوئے باقی آزاد علاقے میں پہنچ گئے ان میں زخمی بھی شامل تھے۔" [1]

--- فوج کی یہ سب بغاوتیں دراصل مولانا عنایت علیؒ کی تبلیغ اور دعوت جہاد کا مرہون منت تھیں۔ اکثر فوجی جذبہ جہاد سے سرشار انگریزوں سے متنفر ہو گئے اور خنزیر کی چربی والے کارتوس وغیرہ باتیں تمام کی تمام ان میں اس لئے پھیلائی گئیں تاکہ انگریز کو اپنا جانی اور مذہبی دشمن سمجھنے لگیں۔

مجاہدین کیلئے یہ حالات بہت سازگار تھے لیکن کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے ' اپنوں کی غداریوں اور خصوصا کاغان کے سادات خاندان کی بدعہدی ' اخوند سوات کا سلوک ' اور خوانین کی منافقت پھر آڑے آ گئی۔ سرحدی خوانین کی حالت حد درجہ عجیب و غریب اور خاصی حوصلہ فرسا تھی وہ جب دیکھتے کہ کوئی خاص خطرہ درپیش نہیں تو مولانا کے ساتھ ہو جاتے اور جب ان پر انگریزوں کا دباؤ پڑتا تھا تو مخالفت پر اتر آتے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء) جنگ آزادی کا آغاز ہوا اسی روز سید اکبر شاہ جو سوات کا بادشاہ تھا اور مجاہدین کا پشت پناہ تھا وہ فوت ہو گیا۔ اس کے بھائی سید شاہ مدار نے بھائی کے خلاف بغاوت کو فرو کرتے ہوئے شہادت پائی غرضیکہ سب سہارے آہستہ آہستہ ٹوٹ گئے۔ ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء کی تاریخی جنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں انگریزوں کا بہت بھاری جانی نقصان ہوا اور رائل فیملی کے کئی افراد مارے گئے ' اس طرح انگریز زخمی سانپ کی طرح مجاہدین پر پل پڑا۔ "مولانا عنایت علیؒ نے جاں بازی کی منزل میں قدم رکھا تھا تو اسے ایک اہم دینی و اسلامی فرض سمجھا تھا۔ جو بہرحال ادا ہونا چاہئے تھا۔ اسباب اور ماحول کی سازگاری و ناسازگاری اس فرض پر اثر انداز نہ ہو سکتی

---

[1] سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۶-۲۷۷

تھی ' مولانا کا نقطہ نگاہ زندگی کے آخری سانس تک یہی رہا اور میرے نزدیک صحیح نقطہ نگاہ یہی ہے "ا۔ سمہ ' نارنجی ایسے سخت اور جاں توڑ معرکوں نے مجاہدین کو سخت نقصان پہنچایا۔ انگریز کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا۔ بقول مولانا عبدالرحیم صاحب "۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پر خطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھے اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کیلئے کوئی سامان کیا جا سکتا؟ مسلسل فاقہ کشی نے حال تباہ کر دیا۔ درختوں کی کونپلوں اور پتوں پر اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلے پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلودہ ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ نقود تھے آپ مہاجرین و انصار پر خرچ کر چکے تھے.... زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی امتیں مضطر ہو کر متی نصر اللہ (مدد کب آئے گی) پکار اٹھی تھیں۔ "۲۔

اللھم بالرفیق الاعلیٰ

" مولانا عنایت علی " چنئی کیلئے روانہ ہوئے تھے۔ نور بانڈو کے مقام پر پہنچے تھے کہ بیمار ہوئے۔ ضیق النفس کے مریض پہلے ہی تھے۔ فاقہ کشی اور درختوں کے پتے اور کونپلیں کھانے سے مرض اور بڑھ گیا۔ اسی اثناء میں شدید بخار نے آلیا اور بے ہوشی طاری رہنے لگی۔ حالت قدرے سنبھلی تو ساتھی چارپائی اٹھا کر چنئی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حالت بگڑ گئی اور بخار بہت تیز ہو گیا۔ مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی۔ شاید وصیت لکھنا چاہتے تھے مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ سکرات موت کے لمحات نے آلیا۔ اکلوتے صاحبزادے حافظ عبدالمجید نے گلوگیر آواز میں پوچھا " حضرت ہمیں کس پر چھوڑے جاتے ہیں۔ آپ کے بعد امیر کون ہو گا؟ لیکن مولانا کسی اور عالم میں تھے ' آنکھیں آسمان سے یوں لگی ہوئی تھیں جیسے اسے چیر کر کہیں دور دیکھ رہی ہوں۔ گورا چہرہ جو سخت ریاض و مشقت اور مصائب و شدائد کی زندگی سے گندم گوں ہو گیا تھا۔ چمک اٹھا تھا ' پھر ہونٹ پھڑپھڑائے اور " تذکرۂ صادقہ " کے الفاظ میں " اللھم بالرفیق الاعلیٰ " سے زبان تر کرتے ہوئے سجن المومن سے جنت نعیم کی طرف رحلت فرما گئے "۳ ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون عمر چھیاسٹھ ستاسٹھ برس تھی۔ تاریخ غالباً ۸ ,۶ شعبان ۱۲۷۴ھ (

ا۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۶ ۲۔ تذکرۂ صادقہ صفحہ ۱۳۸ ۳۔ سید بادشاہ کا قافلہ ۲۰۵

۲۲ مارچ ۱۸۵۸ء) تھی۔

"من المومنین رجال صدقو اما عاھدو االلہ علیہ"

مراکز کی تباہی

جماعت مجاہدین کے تیسرے دور میں جن مراکز کو شہرت نصیب ہوئی' ان میں پنجتار' چن گلئی' منگل تھانہ اور ستھانہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ "مولانا عنایت علیؒ کے انتقال نے مقامی خوانین' رؤسا اور انگریزوں کی راہ سے بڑی رکاوٹ دور کر دی جسے وہ اپنے آئے دن کی مشترکہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے دور نہ کر سکے تھے۔ مولانا عنایت علیؒ کے صاحبزادے حافظ عبدالمجید کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مجاہدین نے مولانا نور اللہ کو امیر منتخب کر لیا۔

مولانا نور اللہؒ

۱۸۶۲ء (۱۲۷۲ھ)

انگریزوں نے نئے حالات میں مجاہدین کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ میجر جنرل سڈنی کی کمان میں پانچ ہزار جوانوں پر مشتمل انگریزی فوج ۲۵ اپریل کو ان علاقوں کی طرف بڑھی جو مجاہدین کی قوت کے مرکز تھے۔ ملکی خوانین کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔ پہلے پنجتار کو توپوں سے گولہ باری کر کے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ (۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء) پھر چنگلئی کا رخ کیا اور اسے بھی پنجتار ہی کی طرح ملبے کے ڈھیر میں بدل ڈالا "۱۔ مولانا غلام رسول مہرؒ لکھتے ہیں: "پنجتار پہلے ہی جل چکا تھا۔ انگریزی دستے نے وہاں پہنچ کر جگہ جگہ توپیں لگائیں اور پنجتار کی دیواروں کو مسمار کر ڈالا"

نہ بگذاشت تارے ازاں پنجتار	کہ بہ ہر سر تار انداخت نار

جدا کرد پیوند ہا راز دوخت	سراسر ہمہ تارہا را لبسوخت ۲۔

"اب منگل تھانہ کی باری تھی اور آخر میں ستھانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

زعباسیاں خان و ناموس رفت	زافرنگیاں نام تا روس رفت

زعباسیاں ہرچہ آباد بود	بہ حکم کمشنر خرابش نمود

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۲۰۷	۲۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۹۰۔۲۹۱

؎ کہ خوفے نہ بود از چپ و راستش وز آنجا نمود آنچہ دل خواستش ۱؎

عباسیوں کی وجہ سے عزت چلی گئی۔ انگریزوں کی وجہ سے نام روس تک چلا گیا۔ جو عباسیوں کی وجہ سے آباد تھا وہ کمشنر کی وجہ سے ویران ہو گیا۔

"انگریزوں نے ستھانہ کو بے دردی سے تباہ کیا۔ توپیں لگا کر گاؤں مسمار کر ڈالا۔ ہاتھیوں سے مجاہدین کا قلعہ تڑوا دیا۔ منڈی اور مرکز مجاہدین کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ سید عبدالجبار شاہ کے مطابق ستھانہ کی دو آبادیاں تھیں: ایک زیریں ستھانہ جس میں عام لوگ رہتے تھے۔ دوسرا بالائی ستھانہ جہاں سید عمر شاہ مقیم تھا۔ بالائی ستھانہ کو بارود سے اڑا دیا گیا۔ سایہ دار درختوں کو بھی کاٹ ڈالا۔ جو کٹ نہ سکے ان کی چھال ایک ایک فٹ اتار دی گئی تاکہ خود بخود خشک ہو جائیں: مولانا عبدالحق آروی نے اس آبادی سے متعلق لکھا ہے:'

؎ ستھانہ ہماں جا بہ حد کیاست ستھانہ مگو بلکہ شہر حیاست
؎ در آں سیداں جملہ مہماں پرست دہند و خوانند آنچہ آید بدست
؎ ہماں سیداں تاج سادات اند چو سادات باچار عادات اند
؎ وجیہ و سخی و شجاعت نشاں چہارم دیانت ازاں جملہ واں ۲؎

ملکا

"مجاہدین کو اب پھر نئے مرکز کی ضرورت تھی اور وہ بھی سید اکبر شاہ کے بیٹوں اور بھتیجوں نے مہیا کی۔ ستھانہ سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر "ملکا" اپنی آغوش وا کئے کھڑا تھا۔ یہ مہابن کے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گمنام بستی تھی۔ مولانا نور اللہ صاحبؒ نے یہاں مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا اور میر مقصود علی نے جو وطن گئے ہوئے تھے واپس آ کر قیادت سنبھال لی۔ انہوں نے مجاہدین کی از سر نو تنظیم کی۔ ڈیڑھ برس بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب اس عظیم منصب کیلئے نگاہ انتخاب مولانا ولایت علی صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ پر پڑی جو اسی زمانے میں گھر بار چھوڑ کر دوبارہ سرحد پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ انہیں اتفاق رائے سے امیر منتخب کر لیا گیا۔ (۱۲۷۸ھ / ۱۸۸۲ء) ۳؎

۱؎ ایضاً صفحہ ۲۹۱ ۲؎ ایضاً صفحہ ۲۹۶ ۳؎ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۲۰۷

اسلامی ریاست کا مرکز اور مہاجرین کی آمد سے ملکا کی آبادی بڑھ گئی۔ پرانی آبادی کے ساتھ ہی نئی آبادی تعمیر ہوئی۔ بارود کا کارخانہ بھی بنایا گیا۔
اس طرح گولہ بارود کی حد تک خود کفیل ہونے کی سعی کی گئی۔ راہ حق کے ان فداکاروں کی آمد سے پہلے ملکا میں زندگی کا دریا بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔۔۔۔ لیکن اب وہ ایک ایسی تحریک کا فوجی مرکز تھا جس کی طوفانی لہریں دہلی اور لندن کے ایوانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اب سکون کی جگہ تحرک اور جمود کی جگہ حق کی راہ میں تگ و دو اور جہاد نے لے لی۔۔۔ اس طرح سادات ستھانہ کی حق پرستی کے طفیل یہ گمنام بستی بھی ستھانہ کی طرح تاریخ کے اوراق میں نقش دوام بن کر دمکنے لگی۔"۱

چوتھا دور۔ مولانا عبداللہ ؒ

۱۲۷۸ھ ۱۳۲۰ھ

۱۸۶۲ء ۱۹۰۲ء

"اس وقت "ملکا" کے امیر مولانا ولایت علیؒ کے صاحبزادے مولانا عبداللہ تھے۔ عظیم باپ کے عظیم فرزند ابھی بالکل نوعمر تھے کہ والد گرامی کے ساتھ جنگ و جہاد کی وادی پرخار میں قدم رکھا اور پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے ساتھ لڑے جانے والے معرکوں میں صف اول میں رہے۔ وہ محض جنگ جو ہی نہ تھے بلکہ فوجی معاملات میں گہری بصیرت رکھنے والے ذہین جرنیل بھی تھے"۲۔

جماعت مجاہدین کا چوتھا دور ان کی امارت سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ مولانا غلام رسول مہرؒ رقمطراز ہیں: "مولانا مقصود علیؒ کی وفات پر ان کے فرزند مولانا اسحٰق صاحب کو تمام بنگالیوں کی امداد حاصل تھی۔ چوں کہ مولانا عبداللہ صاحبؒ کو جنگی امور کا وسیع تجربہ حاصل تھا اس لئے انہیں کے نام قرعہ انتخاب پڑا۔ ان کا عہد امارت کم و بیش چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے اور مجاہدین کی سرگذشت کا یہ سب سے زیادہ شاندار باب ہے"۳

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۲۱۷-۱۸ ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۱۹ ۳۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۰۲،۳۰۳

مولانا عبداللہ صاحبؒ کے دور کا سب سے اہم واقعہ "جنگ امبیلہ" ہے۔ انگریز نے اس جنگ میں اپنی ساری قوت جھونک دی۔ اس جنگ سے پہلے کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی لڑی گئیں۔ مولانا غلام رسول مہرؒ نے "امبیلہ" کی مختلف جنگوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کی تفصیل میں پورے پچاس صفحات صفحہ ۳۰۱ تا صفحہ ۳۴۹ ۱؎ صرف کئے ہیں۔ مولانا خالد گرجاکھی صاحب نے "تحریک مجاہدین کا آخری دور" میں لکھا ہے:

"۱۸۶۳ء کی جنگ امبیلہ جو امیر عبداللہ صاحبؒ کی سرکردگی میں لڑی گئی۔ اس میں انگریز کا بہت ہی نقصان ہوا۔ ڈاکٹر ہنٹر "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتا ہے: تمام شمالی ہند کی فوج اکٹھی کر کے مجاہدین کے مقابلے کیلئے بھیج دی گئی۔ فوج کی قوت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تمام سپاہی جمع کر کے مجاہدین کے مقابلے کیلئے بھیج دیئے گئے یہاں تک کہ وائسرائے کے حفاظتی دستے کیلئے گارڈ مہیا نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جو حشر مجاہدین نے ان کا کیا دیکھنے اور سننے کے قابل ہے..... سب سے پہلے ۲۰ تاریخ رات کو شب خون مارا گیا، پہلے تو مجاہدین نے انگریز فوج کو دو حصوں میں چیرنے کی کوشش کی مگر بروقت پتہ چل جانے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ ایک سپاہی لکھتا ہے کہ شبخون کا نظارہ نہایت ہیبتناک تھا۔ سامنے جنگل تھا، پہاڑوں پر روشنی دھند لکی ستاروں کی طرح معلوم ہو رہی تھی کہ اچانک اللہ اکبر کی خوفناک آواز بلند ہوئی پھر بندوقیں چلنے لگیں۔ پھر یکدم تلواروں کی جھنکار سنائی دی، یہ آواز سناٹے میں جنگل کے اندر بہت ڈراؤنی گونج پیدا کر رہی تھی، پھر اچانک مجاہدین ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے ہوئے (ایمونیشن) پہاڑوں پر چلے گئے۔ پھر تحکمانہ لہجہ میں آواز آئی "جنگ بند کرو" اس کے بعد گولی چلنی بند ہو گئی اور ان کے پاؤں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جوں جوں دیر ہوتی جا رہی تھی ہمارے خطرات بڑھتے جا رہے تھے اور مجاہدین کی طاقت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن کافی فوج ہونے کے باوجود ہم آگے بڑھنے کے قابل نہ تھے۔

"--- ... ۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا کہ مجاہدین کے خلاف مہم روانہ کر دینا، دنیا کے ۵۳ ہزار جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی

۱؎ ایضاً سرگزشت مجاہدین

طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے " ـــــ مجاہدین کا یہ کیمپ جس قدر امن کے زمانے میں ہماری توہین کا باعث تھا اس سے کہیں زیادہ جنگ کے زمانہ میں ہماری تباہی کا سبب بن گیا۔ "[1]

جنگ کا انجام

اس جنگ کا نتیجہ ہمیشہ کی طرح وہی نکلا ' کہ انگریز کی منافقانہ سیاست آڑے آئی ۔ مجاہدین نے اپنے خون کی بے پناہ قربانیوں سے تاریخ اسلام میں نئے باب رقم کئے ۔ " جنگ کا انجام کیا ہوا ۔ مولانا غلام رسول " رقمطراز ہیں ۔

" ادھر جنگ جاری تھی ادھر انگریز سیاست بدستور قبائل میں تفرقہ انگیزی کی کوششیں کر رہی تھی ۔ قبائل کی تربیت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ دیر تک جنگ جاری رکھ سکتے ۔ کشمکش جتنا طول پکڑتی گئی قبائل میں انتشار کے امکانات بڑھتے گئے ۔ کمشنر نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی سرگرمیاں بہت تیز کر دیں اور مختلف حیلوں بہانوں یا رشوتوں سے بعض قبیلوں اور بڑے بڑے خوانین کو ہم نوا بنا لیا ۔ ان کے سامنے یہ شرطیں پیش کیں کہ کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں ' صرف اتنا کافی ہے کہ ہندوستانی مجاہدین کو ملکا سے نکال دیا جائے اور اس آبادی کو برباد کرنے میں مدد دی جائے ۔ چنانچہ کئی قبیلے اس پر راضی ہو گئے اور مقابلہ چھوڑ بیٹھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی کا جو طوفان جوش و خروش سے اٹھا تھا وہ ٹھنڈا پڑنے لگا ۔ جنرل گارووگ نے ۱۵ دسمبر کو فوج کے دو جیش تیار کئے اور لالو پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے جلا دیا ۔ وہاں سے امیلہ پر یورش کی ۔ یہ گاؤں بھی خالی ہو چکا تھا اسے بھی جلا دیا .....

گفت و شنید کے بعد قرار پایا کہ اہل بونیر پیچھے ہٹ جائیں ۔ ان کے خوانین میں سے بعض انگریز افسروں کی موجودگی میں ملکا کو تباہ کر دیں اور اس اثناء میں باقی خوانین بہ طور یرغمال انگریزوں کے پاس رہیں ۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر کو چند انگریز افسر اور تھوڑے سے سپاہی خوانین بونیر اور بعض دوسرے رئیسوں کی ایک جماعت کے ہمراہ ملکا گئے اور اپنا مقصد پورا کر کے ۲۲ دسمبر کو واپس آ گئے ۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی فوج کی مراجعت شروع ہو گئی ۔ انگریزوں کا اندازہ ہے کہ اس جنگ میں دو سو اڑتیس افسر اور اہل فوج مقتول

ا ۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۳۷ ـ ۳۶

ہوئے چھ سو ستر مجروح۔ قبائلی مقتولین و مجروحین کا اندازہ ۳۰۰۰ تین ہزار کیا گیا"" ا۔

شکست کے اسباب

شکست کے اسباب میں ہمیشہ سے وہی عوامل کار فرما رہے ہیں جو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شہادت میں کار فرما تھے۔ مولانا غلام رسولؒ نے صحیح تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں:۔

" قبائلیوں کی بہادری اور غیرت و حمیت میں قطعاً کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان میں دو خرابیاں تھیں:

ایک یہ کہ وہ منظّم جنگ کی تربیت سے نا آشنا تھے۔ دوسرے بعض موقعوں پر بہادری کی نمائش میں بہترین جنگی مصلحتوں کو بھی نظر انداز کر جاتے تھے چنانچہ غزوۂ بونیر کی دوسری جنگ میں اسی خرابی کے باعث انہیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا" ۲۔

خاص طور پر قابل غور امر یہ ہے کہ قبائل میں صحیح دینی تعلیم نہ تھی جس کیلئے سید احمد شہیدؒ نے کوشش شروع کی تھی لیکن خود غرض خوانین نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ غرض وہ لوگ وقتی طور پر جوش میں آ جاتے تھے اور دینی صداؤں سے متاثر بھی ہوتے تھے لیکن مستقل دینی اور قومی کاموں کیلئے جس تربیت کی ضرورت تھی وہ ان میں موجود نہ تھی" نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتی جانی قربانیوں کے باوجود وہ انگریزوں کی مزاحمت میں بہ قدر آرزو کامیاب نہ ہو سکے اور انگریز ابتدائے کار میں مصالحت کی جو شرطیں پیش کر رہے تھے اب اکثر لوگ ان کی طرف مائل ہونے لگے۔ جو خوانین انگریزوں کے ساتھ تھے وہ بھی اپنے نقطہ نگاہ کی اشاعت کرتے رہتے تھے۔ جن خوانین نے انگریزوں سے روپیہ لے رکھا تھا' وہ بھی سرگرم کار تھے۔ تمام اسباب و محرکات نے مل کر انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کا سامان فراہم کر دیا ۳۔

مجاہدین کا مثالی کردار

فتح و شکست تو مقدر کی بات ہے۔ میر نے خوب کہا تھا۔

؎ شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر　　مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ا۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۳۱　　۲۔ ایضاً صفحہ ۳۳۶　　۳۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۳-۳۴۲

جب جنگ کا بوجھ تنہا امیر المجاہدین حضرت عبداللہ صاحب ؒ پر آن پڑا تو انہوں نے اس معاملے میں ذرہ برابر بھی مداہنت نہیں کی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ " کہ وہ راہ حق میں قربانی کا عملی نمونہ ان ہزاروں مسلمانوں کے سامنے پیش کریں جو باوجود کثرت تعداد میدان چھوڑ کر الگ ہو رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ شجاعت و مردانگی کی نمائش نہ تھی۔ اس کا مدعا یہ بھی نہ تھا کہ دنیا پر واضح ہو جائے ' مجاہدین اپنے امیر کے حکم پر کس طرح جانیں دے دینے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ اصل غرض یہ تھی کہ شاید قربانی کا عملی نمونہ ان مسلمانوں میں اسلامی جاں بازی کا جذبہ بیدار کر دے ' جو تماشائیوں کی حیثیت میں پہاڑ کی اونچی دیوار پر کھڑے تھے۔ زبانی دعوت کا وقت نہ تھا ' عملی دعوت کا موقعہ آگیا تھا۔ امیر المجاہدین نے اس کا بھی انتظام کر دیا۔ امیلہ کے میدان میں راہ حق کے ان مجاہدوں نے جو نمونہ دکھایا اس کی مثالیں تاریخ کے صفحات پر بہت کم یاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ امیلہ کی خاک کے ذروں ' کوہ گڑو کے پتھروں ' وادی چملہ کے مرغزاروں اور قریبی جنگل کے درختوں کو گویائی کی قوت عطا کر دے تو وہی یہ خونچکاں داستاں احسن طریق پر سنا سکتے ہیں" ۱ـ

حاصل مطالعہ

جنگ امیلہ کے واقعات پڑھتے ہوئے جماعت مجاہدین کے افراد کیلئے جو سبق اور جو سرمایہ حیات میسر آتا ہے وہ امیر المجاہدین حضرت مولانا عبداللہ صاحب ؒ کی وہ تقریر اور دعا ہے جو آپ نے اپنے مجاہدین کو میدان کارزار کی طرف رخصت کرتے ہوئے فرمائی۔ کاش ہر مجاہد کا یہی سرمایہ حیات بن جائے۔ امیر المجاہدین نے اپنے دو سو جانبازوں کو انگریزوں کی قوت قاہرہ کے سامنے کھڑا کر کے فرمایا:۔

" بھائیو! ہر مجاہد کا جسم زخموں سے لالہ زار بن جانے والا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ ہمارے چمن کی یہ بہار ہمیشہ تازہ رہے گی۔ دشمن جنگ کیلئے آیا ہے۔ اس کے مقابلے سے ہٹنا ہمارے لئے گناہ ہے۔ تمہارے جسموں کا ایک ایک ٹکڑا بھی کٹ جائے تو پروا نہ کرو۔ دشمن کو پیٹھ دکھانا ہمارے لئے زیبا نہیں۔ تم جس آزمائش میں پڑنے والے ہو اس کی ہولناکیوں سے میں ناواقف نہیں لیکن تمہیں معلوم ہے کہ لوہا جب تک آگ میں

۱ـ ایضاً صفحہ ۳۴۴

پگھل نہیں جاتا' اس سے جنگی ہتھیار نہیں بن سکتے " اس کے بعد حضرت عبداللہ صاحب " نے دعا کیلئے اپنے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں بلند کر دیئے اور یوں موتیوں کی ایک لڑی زبان سے ادا ہونے لگی: " الٰہی تو جہانوں کا کارساز ہے ۔ تیرے سوا ہم کسی کی پناہ نہیں ڈھونڈتے ۔ زور اور قوت تیرے ہاتھ ہے ۔ ہم ناچیز مسکین کیا کر سکتے ہیں ؟ تو غریبوں اور بیکسوں کا مددگار ہے ۔ تیرے سوا کسی سے یاوری کی امید نہیں ۔ اس جنگ میں صرف تیری مدد درکار ہے ۔ یہ مجاہد صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں ۔ تو ہی اپنی رحمت سے انہیں زور اور قوت بخش سکتا ہے ۔ تو نے مومنوں کیلئے نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے ۔ مالک الملک ! دشمنان دین پر ہمیں فتح عطا کر ۔ میں ان غریب الوطنوں بے کسوں کو تیرے حوالے کرتا ہوں ۔ یہ سب تیری راہ میں جان کی قربانی پیش کریں گے ۔ اگر ملکی فوج ہمارا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں تو ہمیں کیا پروا ہے ' اس کارزار میں فقط تو ہمارا مددگار ہے "۔ شاعر نے اسی تقریر اور دعا کر ترجمہ کیا ہے ۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے ۔

؎ کٹیں جو چند ٹہنیاں نخل ہو ہری بھری ۔ چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل ناک کی

پھر مجاہدین سے مخاطب ہوئے : " بھائیو ! اللہ تمہارا مددگار ہو ' وہی پاک ذات تمہارے لئے کافی ہے ۔ میری طرف سے سلام قبول کرو ۔ تم اس میدان میں رہ کر وہ فرض بجا لاؤ جو اللہ نے تمہارے ذمے عائد کر رکھا ہے ۔ تمام مجاہدوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی تو معاف فرما دیجئے ۔ امیر نے بلند آواز میں فرمایا میں نے اللہ کے لئے ہر خطا معاف کر دی ۔ تم بھی میری خطاؤں کو معاف کر دو ۔ یہ کہتے ہی باقی ساتھیوں کو لے کر امیر صاحب ذرا بلندی پر جا کر کھڑے ہو گئے ۔ قبائلیوں میں سے بھی کوئی میدان میں باقی نہ رہا ۔ صرف دو سو کی جماعت باقی رہ گئی جس کی حق آئینی اس میدان میں آفتاب عالم تاب سے بڑھ کر درخشاں تھی "[1]

راہ حق کے شہید و وفا کی تصویر....

" مجاہدین اگرچہ دشمن کے مقابلے پر تھوڑے تھے تاہم وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح استوار کھڑے تھے ۔ انگریزی فوجیں نمودار ہوئیں تو مجاہدین نے پہلے ایک باڑھ ماری ' پھر ہر طرف سے توپیں اور بندوقیں آگ اگلنے لگیں پورا میدان دھوئیں سے تیرہ و

[1] سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۴۵-۴۶

تار ہو گیا۔ مجاہدین نے تلواریں علم کیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑے ان کی مثال وہی تھی جیسے پروانے شمع پر گرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق" لکھتے ہیں:

۔ نہ ترسد مجاہد ز توپ و تفنگ　　برد خویشتن را بہ میدان جنگ

۔ چو بلبل کند قصد گلزار را　　فرامش کند سختی کار را

۔ چو بیند رخ شمع پروانہ زار　　بسوزد تن خویش دیوانہ وار

۔ تو دیوانہ گوئش، دیوانہ　　کہ آگہ نہ از ذوق پروانہ

۔ خدا ہر کرا مہ عقل داد　　بکوشد بہ مال و سر اندر جہاد ا۔

ترجمہ:۔ مجاہد توپ اور بندوق سے کبھی نہیں ڈرتا وہ ہر خوف سے بے پروا ہو کر میدان جنگ میں پہنچتا ہے۔ بلبل جب باغ کا قصد کرتی ہے تو ہر سختی بھول جاتی ہے۔ پروانہ شمع کا رخ روشن دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو دیوانہ وار اس کی آگ میں جلا دیتا ہے۔ تو اسے دیوانہ کہتا ہے تو سمجھ لے کہ تو خود دیوانہ ہے اس لئے کہ پروانے کے ذوق سے تجھے قطعاً آگاہی نہیں۔ خدا جسے عقل سلیم کی نعمت دیتا ہے وہ مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے کوشاں رہتا ہے"

چونکہ سارا میدان دھوئیں کے تاریک بادلوں میں مستور تھا اس لئے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس کا کیا حال ہوا۔ شہزادہ اور سید محمود محفوظ رہے، البتہ مجاہدین سب کے سب مقام شہادت پر سرفراز ہوئے۔ افسوس کہ اس بے مثال قربانی سے دعوت جہاد کو موثر بنانے کی جو غرض پیش نظر تھی وہ پوری نہ ہوئی، تاہم مجاہدوں نے اپنے خون حیات سے امیلہ کے میدان میں جو نقش مرتسم کیا تھا، وہ زمانے کی گردش سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا اور انشاء اللہ تاقیامت محفوظ رہے گا۔"۲۔

غازیو شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں　　حیات بھی حیات ہے تو موت بھی حیات ہے

۔ راہ حق کے شہیدو وفا کی تصویرو
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

گنج شہیداں

"شہداء کو میدان جنگ ہی کے ایک گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ امیلہ گاؤں کے

۱۔ ایضاً صفحہ ۳۴۶-۴۷　　۲۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۴۷

پیچھے چیڑ کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے ۔ اسی جگہ مجاہدین کا قبرستان ہے ۔ کہتے ہیں کہ انجیر کے درخت کے پاس ایک بڑی ڈھیری ہے جسے "گنج شہیداں" سمجھنا چاہئے ۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ مقابلے پر جو صحابہ شہید ہوئے ان کا مدفن آج بھی ریاض (سعودی عرب) سے ۷۰ کلومیٹر دور خرج کے قریب یمامہ کی بستی میں موجود ہے ۔ بندۂ ناچیز کو وہاں جانے کا شرف حاصل ہوا ۔ دیکھئے جنگ امیلہ کے مجاہدین کو ان صحابہ کرام سے کیسی نسبت ہے ۔

در آں دائرہ سر مجاہد نہاد ۔۔۔ دو لک آفریں بہ ہر مرد باد

چو قبلہ نما بد سر ہر شہید ۔۔۔ سوئے قبلہ می شد حکم مجید

تو گوئی کہ آں کشت گلزار شد ۔۔۔ بہ خون شہیداں چو گلنار شد

(مجاہدوں نے اس میدان کارزار میں اپنے سر قربان کرائے ۔ ہر صاحب حوصلہ پر دو لاکھ بار آفریں ۔ ہر شہید کا سر قبلے کا پتہ دے رہا تھا ۔ شہادت کے بعد اللہ کے حکم سے ان سب کے سر قبلہ رو ہو گئے ۔ تو کہے گا کہ وہ کھیتی گلزار ہو گئی اور شہیدوں کے خون سے گلنار کی طرح بن گئی) امیلہ کی جنگ میں کم و بیش چار سو مجاہدین شہید ہوئے ۔ ان میں دو سو وہ تھے جنہوں نے ناصر محمد اور کلیم الدین کی سالاری میں تنہا انگریزی قوت کا مقابلہ کیا ۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی نے ان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ صابر و شاکر ہر وقت ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے ۔ ان کے پہرے دار ایک دوسرے کو آواز دیتے تو ایسے انداز میں "سبحان اللہ" کا نعرہ بلند کرتے کہ جو یہ نعرہ سنتا اس کا دل تڑپ اٹھتا ۔ دوسرا پہرے دار جواب میں کہتا: الحمد للہ

تیسرا پکارتا یرحمکم اللہ ۔ چوتھا جواب دیتا: **یھدیکم اللہ** ---- یہ جماعت ذات باری تعالٰی کے عاشقوں کی جماعت تھی ۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اللہ کی راہ میں قربان ہو جائیں ۔ اگر کسی کو میدان جنگ میں شہادت کی عزت نہ ملتی تو وہ اسے اپنی کم نصیبی سمجھتا ۔ یہ وقتی جوش کا معاملہ نہ تھا بلکہ **ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا** " (فصلت: ۳۰) کے مطابق انہوں نے اسی دھن اور شوق میں عمریں گزار دیں اور ہر قسم کے مصائب بہ طیب خاطر قبول کر لئے ۔ مثلاً غربت، مسافرت، بھوک، سردی، گرمی

'زمین پر سونا' ضروریات زندگی سے محروم رہنا"۔ ا ؎

؎ افسوس تم نے وہ لوگ ایک ہی شوخی میں کھو دیئے ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کے

دعوت و ارشاد

ہندوستان کے مختلف حصوں میں سید احمد شہیدؒ کے زمانے سے دعوت و تبلیغ کا کام جاری تھا۔ اس میں اصلاح عقائد و اعمال کے علاوہ یہ تلقین بھی کی جاتی تھی کہ دوسرے فرائض و ارکان کے ساتھ جہاد بھی اسلام کا ایک بہت بڑا رکن ہے۔ جہاد کیلئے آدمی بھی فراہم کئے جاتے تھے اور روپیہ بھی' جب پنجاب میں سکھوں کی عملداری ختم ہوئی اور ان کی جگہ انگریز آ گئے تو " جماعت مجاہدین " کا تصادم براہ راست ان سے ہوا اور ہندوستان کے اندر کام کرنے والوں کیلئے اک گونہ نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ مجھے تفصیلی کیفیت تو معلوم نہ ہو سکی لیکن خیال ہے وہ سمجھتے ہونگے کہ دعوت و تہیہ جہاد اہم اصلاحی فرائض میں داخل ہے اور جب تک جس طور اس فرض کو انجام دینے کا موقع ملے تامل نہ ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے بعض داعیوں کا تاثر یہ ہو کہ مجاہدین ہندوستان میں نہیں بلکہ آزاد علاقے میں رہتے ہیں اور انہیں حسب استطاعت رقمیں پہنچانا یا شیفتگان جہاد کے لئے سرحد پہنچنے کا انتظام کر دینا جرم نہیں ہے۔ انگریزوں نے ابتدا میں اس طرف چنداں توجہ نہ دی۔ جب دیکھا کہ مجاہدین خاصا خطرہ بن سکتے ہیں تو کاوش شروع ہوئی کہ انہیں امداد کہاں سے ملتی ہے؟ چونکہ سارا نظام ابتدا سے خاص مصلحتوں کی بنا پر خفیہ رکھا گیا تھا اس لئے کسی کو صحیح سراغ نہ مل سکا اور بلا ثبوت دارو گیر کا ہنگامہ برپا کر دینے کے لئے کوئی وجہ جواز نہ تھی اگرچہ بعد میں ذکی الحس انگریز افسروں نے اسے ایک ہیبت انگیز سلسلے کی شکل دے دی۔ ۲؎

مقدمات کا آغاز

ہوتی' مردان کا ٹپہ کمال زئی کا ایک پٹھان غزن خاں بن جدن خاں سارجنٹ پولیس وہ بدبخت انسان ہے جس نے ایک ذاتی سبب سے مجاہدین کے مراکز کی جاسوسی کی اور

۱؎ ایضاً صفحہ ۳۴۸-۴۹ ۲؎ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۵۸

انگریز بہادر کو اس کی خبر دی ۔ تفصیل میں جائے بغیر غزن خاں نے چار بنگالی مجاہدین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلانے کیلئے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ الزام یہ لگایا کہ یہ مجاہدین کو روپیہ اور اسلحہ فراہم کرتے ہیں ۔ اس کا خیال تھا اس طرح انگریز سرکار کے ہاں اس کا مقام بلند ہو جائے گا مگر مجسٹریٹ نے عدم ثبوت کی بنا پر انہیں رہا کر دیا ۔ اس اخلاقی شکست پر غزن خاں آپے سے باہر ہو گیا ۔ "دل میں کینے اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ مسلمانوں کے اس دینی نظام کو انگریزوں کی خاطر برباد کرنے کیلئے تیار ہو گیا جو بے چارگی کی حالت میں ہزار محنتوں اور مشقتوں سے بنایا گیا تھا ۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے بیٹے فیروز کو "ملکا" (مرکز مجاہدین) چلے جانے کا حکم دیا" غزن خاں کا اپنا بیان ہے:

"میرا بیٹا فیروز میرے حکم کے مطابق "ملکا" گیا اور دس روز وہاں ٹھہرا رہا ۔ اس زمانے میں بنگالی ستھیانہ پر پیش قدمی کی تیاری کر رہے تھے ۔ فیروز ان کے ساتھ ستھیانہ اور کھبل گیا ۔ پوری معلومات حاصل کر کے وہاں سے اپنے وطن حمزہ خاں لوٹا" ـــ "

غرض فیروز یہ اطلاع لایا کہ قرابینوں ' رائفلوں اور مجاہدین کو بھیجنے کا ذمہ دار محمد جعفر تھانیسری ہے ۔ مجاہدین امازئی کے ملکوں مدد خاں اور موزہ خاں کے پاس پہنچتے تھے تو فخریہ جتایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی ہمارے دوست ہیں ۔ اس سلسلے میں محمد جعفر کا نام لیا کرتے تھے ' جسے وہاں خلیفہ کہا جاتا تھا گویا وہ کوئی بہت بڑا نواب تھا" ۱؎

۱؎ ایضاً صفحہ ۳۶۰

"یوں غزن خاں اور اس کے بیٹے کی رپورٹ نے پہلی دفعہ مجاہدین کی تنظیم کا راز فاش کیا۔ سوار پولیس کے افسر کپتان موزلی نے رپورٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس بھیجی اور ضلع انبالہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو اس سلسلے میں مزید تحقیقات کا حکم ملا۔" ا۔۔۔۔ اس طرح مجاہدین کے مددگاروں پر ابتلاء کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تفصیلات کیلئے انہی مولانا محمد جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ مولانا محمد جعفر تھانیسری"، محمد شفیع" ٹھیکیدار، منشی عبدالکریم"، عظیم آباد میں مولانا احمد اللہ"، مولانا یحییٰ علی" اور مولانا عبدالرحیم بھی گرفتار ہوئے اور انگریز انتقام کا نشانہ بنے۔ "چنانچہ ہندوستان میں علماء حق کے (وہابیوں) خلاف جگہ جگہ مقدمات کھڑے کئے گئے اور خصوصا اہلحدیث علماء کی شامت ہی آ گئی۔ الا ماشاء اللہ کوئی بازپرس سے رہ گیا ہو۔ حضرت سید میاں نذیر حسین صاحب" (شیخ الکل) جو چوبیں گھنٹے صرف مسجد میں تعلیم و تعلم میں مصروف رہتے وہ بھی سال ڈیڑھ سال انکوائری کے ایام میں جیل کاٹ آئے"۲۔

میاں صاحب مرحوم اہل حدیث کے سرتاج تھے۔ اہل حدیث اور "وہابیوں" کو مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مخبروں نے میاں صاحب کے خلاف بھی شکائتیں حکومت کے پاس پہنچائیں۔ ان کے مکان کی تلاشی ہوئی اور بہت سے خط پائے گئے۔ ان میں مسئلے پوچھے جاتے تھے یا مختلف دینی کتابوں کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا گیا آپ کے پاس اتنے خط کیوں آتے ہیں؟ انہوں نے بے تکلف جواب دیا کہ یہ سوال خط بھیجنے والوں سے کرنا چاہئے نہ کہ مجھ سے۔ ایک خط میں لکھا تھا کہ "نخبتہ الفکر" (اصول حدیث کی کتاب) بھیج دیجئے۔ مخبر نے کہا یہ خاص اصطلاح ہے۔ جس کا مفہوم کچھ اور ہے اور یہ لوگ خطوں میں اصطلاحی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ میاں صاحب نے یہ سنا تو جلال میں آ گئے اور فرمایا: نخبتہ الفکر کیا؟ توپ؟ نخبتہ الفکر کیا؟ بندوق، نخبتہ الفکر کیا؟ گولہ بارود۔ بہرحال آپ کو دہلی سے پنڈی لے گئے وہاں کم و بیش ایک سال جیل خانے میں نظربند رکھا"۳۔

ہم پہ جو گزری سو گزری....

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۶۰ ۲۔ "تحریک مجاہدین کا آخرین دور" صفحہ ۳۸ ۳۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۸۲

جو انسانیت سوز سلوک ان حق پرست مجاہدوں کے ساتھ ہوا اس کی تفصیل سے قلم لرزتا، بدن پر کپکپی طاری ہوتی ہے اور کسی وقت تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ اشارۃ جو سلوک مولانا محمد جعفر صاحب کے ساتھ ہوا وہ ملاحظہ کیجئے: "گرفتاری کے بعد انہیں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ کھانے کو دو روٹیاں اور تھوڑا سا ساگ ملا۔ روٹیوں میں ایک چوتھائی ریت اور مٹی شامل تھی۔ ساگ موٹے موٹے ڈنٹھل تھے جنہیں چبانا بھی دشوار تھا۔ علی گڑھ سے شکرم میں دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو ہتھکڑی اور طوق پہنایا گیا۔ طوق میں ایک اور زنجیر ڈال کر اس کا سرا ایک مسلح سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ کپتان پارسنز اور ایک انسپکٹر مولوی صاحب کے دائیں بائیں بھرے پستول لے کر بیٹھے۔ نہ کھانے کو کچھ دیا نہ پینے کو۔ راستے میں نماز تیمم کر کے اشاروں سے ادا کی جاتی رہی۔ دہلی میں انہیں ایک سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے کے تہہ خانے میں رکھا گیا۔ وہاں سے کرنال اور کرنال سے انبالہ پہنچے۔ جہاں مولوی جعفر صاحب، حسینی عظیم آبادی صاحب اور معظم سردار کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا": ۔۔۔۔۔ خود مولانا جعفر صاحب نے لکھا ہے: کپتان پارسنز، سپرنٹنڈنٹ اور کپتان ٹائی نے کہا کہ سب کچھ بتا دو، میں نے جواب دیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بعد زدوکوب شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب مار کھاتے کھاتے گر پڑے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یقین ہو گیا یہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے، میرے ذمے رمضان کے کچھ روزے بقایا تھے، کچھ کھائے پئے بغیر روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ دوسرے دن زدوکوب کے بعد مجھے ڈپٹی کلکٹر کے بنگلے پر لے گئے۔ چاپلوسی سے کہا کہ سب کچھ بتا دو، تمہیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور بڑا عہدہ بھی دیں گے۔ میں نے انکار کیا تو پھر مار پیٹ شروع ہوئی۔ صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بارہ گھنٹے زدوکوب جاری رہی، افطار کا وقت آیا تو میں نے بنگلہ کے درخت سے پتے توڑ کر روزہ کھولا" [1]

"مولانا عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جن کوٹھڑیوں میں ہمیں بند کیا جاتا تھا ان میں سے ہر کوٹھڑی پانچ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی ہو گی۔ چھت بہت بلند، اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان، ہر کوٹھڑی نہایت تنگ و تاریک تھی۔ شب و روز میں ایک بار اس کا دروازہ

1۔ ایضاً صفحہ ۶۵-۳۶۴

کھلتا۔ ایک جمعدار اور دو تین سپاہی آتے۔ ان کے ساتھ ایک باورچی ہوتا۔ جس کے ہاتھ میں دو روٹیاں اور دال ہوتی۔ ساتھ ہی ایک سقا جس کی مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی جو گملا لئے آتا' باورچی ہر محبوس کو روٹیاں دال دے دیتا' سقا کوزے میں پانی ڈال دیتا اور بھنگی صاف گملا رکھ جاتا"۱ے

ے قفس میں پرندوں کو مجبور پا کے دکھاتے ہیں صیاد کیا کیا تماشے

ے کسی مست غنچے کی خوشبو چرا لی کسی گل کا نازک بدن بیچ ڈالا

داد کیا ہے؟ فریاد کیا ہے؟

الزامات کیا تھے؟ جوابات کیا تھے؟ عدل کیا تھا؟ انصاف کیا تھا؟ شاعر نے تصویر کشی کی ہے:

ے وہی قاتل' وہی منصف وہی شاہد ٹھہرے اقربا میرے کریں قتل کا دعویٰ کس پر

انبالہ کے اس مقدمے میں سزا یافتہ افراد کی فہرست مع ان کی سزاؤں کے درج ذیل ہے:

۱۔ شیخ محمد شفیع سزائے موت مع ضبطی جائیداد (لاش گورستان جیل میں دفن کی جائے)
۲۔ مولانا یحییٰ علی صاحب " " " " "
۳۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری " " " " (بعد میں کالے پانی کی سزا میں تبدیل کر دی گئی)
۴۔ مولوی عبدالرحیم حبس دوام بہ عبور دریائے شور مع ضبطی جائیداد
۵۔ قاضی میاں جان صاحب " " " " "
۶۔ میاں عبدالغفار صاحب " " " " "
۷۔ منشی عبدالکریم صاحب " " " " "
۸۔ عبدالغفور صاحب " " " " "
۹۔ الٰہی بخش صاحب " " " " "
۱۰۔ حسین عظیم آبادی صاحب " " " " "
۱۱۔ حسین تھانیسری صاحب " " " " "

۱ے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۶۸

انبالہ کے بعد ایک مقدمہ اسی طرح عظیم آباد میں قائم کیا گیا۔ اس میں مولانا احمد اللہ صاحبؒ مولانا مبارک علیؒ' ان کے بیٹے مولانا تبارک علیؒ گرفتار ہوئے۔ ان کیلئے وہی فیصلہ ہوا جو ان کے پیش رؤں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مجاہدین کے خلاف آخری بڑا مقدمہ ۱۸۷۱ء میں عظیم آباد میں قائم ہوا۔ پیر محمد' امیر خاں' حشمت داد خاں' مولوی مبارک علی' مولوی تبارک علی' حاجی دین محمد اور امین الدین مجرم گردانے گئے۔ مولانا مبارک علی کو انڈمان نہ بھیجا گیا' وہ ہندوستان میں ہی حالت اسیری میں فوت ہو گئے۔ مالدہ اور راج محل میں بھی ۱۸۷۵ء میں مقدمے کھڑے کئے گئے' ان میں مولانا امیرالدین اور ابراہیم منڈل کو سزائے حبس دوام بہ عبور دریائے شور مع ضبطی جائیداد ملی۔

چشم تصور سے ذرا اندازہ کیجئے کہ "مصیبت محض یہ نہ تھی کہ ان بزرگوں کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ یہ قید کی تکلیفیں صابرانہ برداشت کر سکتے تھے مگر جائیدادوں کی ضبطی کے باعث ان کے بال بچے بے خانماں کر دیئے گئے تھے اور ان کے لئے نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ تھی' نہ گزارے کا کوئی انتظام تھا' نہ ان میں سے کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ معین و شریک جرم سمجھا جا سکتا تھا" ۱۔

مولانا احمد اللہ صاحبؒ کے اہل و عیال کو عید کے دن گھر سے نکال دیا گیا۔ حکیم عبدالحمید فرماتے ہیں:

۔ چوں شب عہد را سحر کردند   ہمہ را از مکاں بدر کردند
۔ ضبط و تاراج جملہ مال و متاع   نقد و جنس و ہمہ اثاث وزراع
۔ بہر ما بود آہ جرم سخت   بروں سوزنے زجملہ رخت۲۔

ترجمہ: (جونہی صبح عید کا سپیدہ نمودار ہوا تمام اہل و عیال کو مکان بدر کر دیا گیا گھر کا سب مال و متاع' نقدی' جنس اور کھیتیاں ہر چیز ضبط اور تباہ و برباد کر دی گئی جرم اس قدر شدید تھا کہ سوئی تک گھر سے اٹھانے کی اجازت نہ دی گئی)

ذرا تصور کیجئے کہ عید کے دن انہیں نکالا گیا اور کسی کو سوئی تک اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ جزائر انڈیمان (عرف کالا پانی) میں راہ حق کے ان مجاہدوں پر کیا گزری یہ لمبی داستان الم ہے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں:۔

۱۔ ایضاً صفحہ ۳۸۷   ۲۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۸۸

انسانوں کے بھیس میں فرشتے

"اس راستے کی صبر آزمائیاں شدت و وسعت میں میدان جنگ کی صبر آزمائیوں سے کم نہ تھیں۔ بلکہ میں کہوں گا آتش باری اور شمشیرزنی کی گرمی ہنگامہ میں جان دے دینا اتنا مشکل نہیں جتنا مصائب لامتناہی کے ہجوم میں گھل گھل کر اور کڑھ کڑھ کر زندگی کے اوقات گزارنا مشکل ہے۔ ان مجاہدوں کے خاندان 'گھربار اور جائیدادیں تباہ ہوئیں۔ انہوں نے جیلوں کی تاریک کوٹھڑیوں اور انڈیمان کی بھیانک وحشت ناکیوں میں دن بسر کئے 'ایک دوسرے سے دائمی مفارقت بھی قبول کرلی' یہاں تک کہ حقیقی بھائیوں کو عالم غربت میں قبروں کی یکجائی بھی نصیب نہ ہوئی۔ تاہم ان کی جبین عظمت و عزیمت پر کبھی شکن نہ پڑی اور ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔ لاریب وہ انسانوں کی شکل میں فرشتے تھے جو ہماری بگڑی ہوئی تقدیر کو بنانے کے سلسلے میں ایک صحیح عملی نمونہ پیش کرنے کی غرض سے اس دنیا میں آگئے تھے" ا۔

ہم پہ جو گزری سو گزری مگر شب ہجراں ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

علاقہ بونیر اور مجاہدین

جنگ امیلہ کے بعد اخوند صاحب سوات نے مجاہدین کیلئے چغرزئیوں کے علاقے میں قیام کا انتظام کر دیا تھا اور زخمیوں کو بھی وہاں پہنچا دیا تھا۔ سادات ستھانہ اس کے بعد بھی ہمیشہ مجاہدین کے ہمدرد و خیر خواہ رہے۔ مجاہدین نے ان سے حسن علائق کا سلسلہ برابر قائم رکھا۔ تاہم تیس پینتیس برس سے ان کے درمیان دائرہ جہاد میں اشتراک و تعاون اور یک جائی و یک جہتی کی جو صورت چلی آ رہی تھی وہ جنگ امیلہ کے بعد قائم نہ رہی۔ اس لئے قیام گاہیں الگ الگ ہو چکی تھیں اور بعد مکانی کا نتیجہ یہی ہو سکتا کہ ان کی وقتی سرگرمیوں میں پہلے کی سی یک جہتی باقی نہ رہی۔ سرحدی خوانین و اکابر نے مصالحت کیلئے جو شرطیں انگریزوں سے طے کی تھیں بداہتہ ان میں بھی یہ غرض مخفی تھی کہ مجاہدین اور سادات ستھانہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جائیں اور ان کے درمیان مل جل کر رہنے یا ایک دوسرے کو مدد دینے کا کوئی امکان نہ رہے۔ سرحد آزاد

ا۔ ایضاً صفحہ ۳۵۴

کے جس طبقے نے نتائج و عواقب سے بالکل بے پروا ہو کر مجاہدین کو سینے سے لگائے رکھا اور اس عزیز تعلق کی پاسداری میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا وہ صرف سادات ستھانہ تھے ۔ جن کی قوت پر سادات ستھانہ ہر حال میں کامل اعتماد کر سکتے تھے وہ مجاہدین کی قوت تھی ۔ دونوں کی علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین کو سادات ستھانہ جیسے معاون نہ مل سکے اور سادات ستھانہ مجاہدوں جیسے جاں بازوں سے محروم ہو گئے ۔ "جنگ امبیلہ کے بعد مجاہدین خود ہی سادات ستھانہ سے الگ ہو گئے کیونکہ ان کی وجہ سے سادات ستھانہ بار بار ستائے گئے ۔ نیز علاقہ کے خوانین نے چونکہ انگریز سے معاہدے کر لئے تھے اس لئے بھی کبھی مجاہدین کے لئے پریشانی کا باعث بنے ۔ مجاہدین ملکا سے نکل کر علاقہ بونیر چلے گئے اور وہاں کا ایک قلعہ پلوسی تھا' جہاں قریباً بیس برس تک رہے اور تبلیغ اور اصلاحی کام کرتے رہے اور کبھی کبھی جب بھی انگریزوں سے جنگ کا موقع ملتا تھا' ٹلتے نہ تھے ا۔

کرنل واٹلی نے لکھا ہے کہ مجاہدین علاقہ چغرزئی کے علاقے میں کچھ دیر مقیم رہے ۔ جو علاقہ بونیر کی مشہور ندی برندو کے شمال میں واقع ہے لیکن وہاں ان کیلئے امن و اطمینان کی صورت پیدا نہ ہو سکی اس لئے کہ ان کے میزبان یعنی چغرزئی افغان اکثر انہیں اخراج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے :۔ معلوم ہوتا ہے ۱۸۶۸ء میں وہ (مجاہدین) علاقہ چغرزئی سے اٹھ کر باج کٹہ واقع بونیر میں منتقل ہو چکے تھے یہیں اپریل ۱۸۶۸ء میں فیروز شاہ ان سے آملا جو دہلی کے آخری بادشاہ کا فرزند تھا" ۲۔

.... مجاہدین انجام کار حسن زیئوں کے علاقے میں پہنچے اور پلونسی کے قریب میدان میں کچھ زمین پٹے پر لے لی وہاں ۱۸۸۸ تک رہے" ۳۔

کوہ سیاہ کی مہمیں

۱۸۶۹ء میں اور پھر ۱۸۸۸ء میں انگریزوں کی طرف سے مجاہدین پر حملے ہوتے رہے جو کوہ سیاہ کی مہموں کے نام سے موسوم ہوئے ۔ ۱۸۸۸ء تک قریباً انگریز بیس مرتبہ یاغستان پر حملے کر چکے تھے ۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں اگرور کے دو گاؤں برچار اور گل ڈھیری جلا دیئے گئے ۔ اگست ۱۸۶۹ء "جسکوٹ" پر حملہ ہوا ۔ ۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو اکازیئوں کا ایک گاؤں "شہتوت" جلا دیا گیا ۔ ۹ اپریل ۱۸۷۰ء اکازیئوں نے "برچار" پر حملہ کیا ۔ ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء

ا۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۴۰ ۲۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۴۲ ۳۔ واٹلی کی کتاب صفحہ ۱۰۶-۱۰۵ (بحوالہ ۔ ایضاً)

کو اکازئیوں اور خان خیل حسن زئیوں نے "سنبھل بٹ" جلا دیا دونوں طرف سے یہ کشمکش جاری رہی۔ ۱۸۹۱ء کی جنگ کے بعد مجاہدین کو حسن زئیوں' اکازئیوں اور مداخیلوں کے علاقوں سے نکال دیا گیا' تو وہ نئے مرکز کی تلاش میں نکل پڑے۔

نیا مرکز۔ ٹیلوائی

مولانا عبداللہؒ نئے مرکز کی تلاش میں نکلے۔ امازئی قبیلے سے ایک گاؤں اجارے پر حاصل کرنا چاہا' بات نہ بن سکی۔ پھر "مبارک خیلوں" کے پاس آئے انہوں نے بھی من مانی شرائط لگائیں۔ اس وقت بارگاہ خداوندی میں امیر المجاہدین نے یوں ہاتھ بلند کر دیئے' آپ کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ عجز و نیاز سے عرض کی:

"اے عظیم الشان آسمانوں کے بنانے اور قائم کرنے والے خدا! تیری راہ میں اب تک خلوص نیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ صبر اور رضا بہ قضا کا دامن نہیں چھوڑا مگر اب تو تیری زمین پر جگہ ہی نہیں ملتی۔ اب تو ہی بتا! میں کہاں جاؤں' تیری زمین پر بسنے والے تو مجھے اپنے پاس رکھنے کیلئے تیار نہیں" امیر صاحب دعا کر رہے تھے' موصوف کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہم لوگ ایک ڈھیری کی بلندی پر بیٹھے تھے جس کی ایک جانب نالہ جاری تھا۔ یہ دردناک الفاظ امیر صاحب کی زبان سے نکلے تو عین اس وقت سب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ شدید زلزلے کا جھٹکا ہے' ..... تمام حالات پر غور کرنے کے بعد مبارک خیلوں کو یقین ہو گیا کہ یہ جھٹکا امیر صاحب کی دعا کا کرشمہ ہے چنانچہ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ خدا کے ایسے نیک اور حق پرست بندے کو ناراض کرنا غضب کا موجب ہے۔ ٹیلوائی گاؤں خود منت سماجت کر کے امیر صاحب کو اجارے پر دے دیا" چنانچہ تمام مجاہدین وہیں آ بسے۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ کی حیات مبارک کے باقی اوقات اسی جگہ بسر ہوئے۔"[۱]

"مولانا عبداللہؒ نے ۲۷ شعبان ۱۳۲۰ھ (۲۹ نومبر ۱۹۰۲ء) کو وفات پائی۔ ہوش مندی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے باری تعالیٰ کے مطابق راہ حق میں جہاد کرتے ہوئے صرف کیا۔ وہ اس مجاہد کبیر کے فرزند تھے جس کا خاندان بہار کے ممتاز امراء میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا کی والدہ حیدر آباد دکن کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ کی صاحبزادی

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۶۴ (حالات سید عبدالجبار کی کتاب العبرت سے ماخوذ ہیں صفحہ ۳۱۔ ۱۰۔ ۱

تھیں لیکن مولانا نے نہ ددھیال کی امیری سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ ننھیال کی ریاست سے۔ سب کچھ چھوڑ کر انتہائی تکلیفوں' مصیبتوں اور پریشانیوں میں دن گزارے اسی لئے کہ حصول رضا کا راستہ یہی تھا۔ مولانا کا عہد چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے اور جماعت مجاہدین کی سرگزشت کا یہ نہایت شاندار باب ہے ۱۔

؎ یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر روسیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

مجاہد' اہلحدیث یا وہابی

یہ بات بھی تاریخی ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر لکھنا ضروری ہے کہ مولانا عبداللہ صاحبؒ کے اس دور میں انگریزوں نے "مجاہدین" پر "وہابی" ہونے کی پھبتی کسی۔ " انگریز کے ذہن میں "وہابی" باغی کے مترادف تھا۔ کیونکہ جس کی طرف یہ لفظ منسوب کیا جاتا ہے وہ محمد بن عبدالوہابؒ نجدی تھا۔ جس نے عرب میں قریباً اسی زمانے میں اصلاحی تجدیدی تحریک شروع کی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے جلد کامیابی سے ہمکنار کیا (موجودہ سعودی عرب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور شریعت مطہرہ کا نفاذ محمدؒ بن عبدالوہاب کا ہی کارنامہ ہے) محمد بن عبدالوہاب کا مذہب یہ تھا کہ انگریز کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت مت کرو کیونکہ وہ مشرک ہے اور مشرک سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں اس وجہ سے انگریز ہر مسلمان مجاہد کو باغی سمجھتا تھا اور اسے اہلحدیث یا "وہابی" کے نام سے موسوم کرتا تھا۔ وہابی کو بطور گالی استعمال کرنے والی مہم انگریز نے ۱۸۶۵ء میں شروع کی۔ " ۱۸۶۸ء میں دہلی سے شہزادہ فیروز شاہ بہادر شاہ کا بھتیجا جب سرحد یاغستان میں مجاہدین کے پاس پہنچا تو اس پر بھی "وہابی" ہونے کا طعنہ کسا گیا' خوانین نے اسے سرحد میں رکھنے سے انکار کر دیا حالانکہ فیروز شاہ مسلکاً اہلحدیث نہ تھا۔ بلکہ صرف انگریز کا باغی ہونے کی وجہ سے اسے "وہابی" کہا گیا۔ گویا کہ اس زمانے میں ہر باغی کو وہابی کہا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے نزدیک انگریز سے بغاوت کوئی شرعی جرم نہ تھا اس لئے " وہابی " کا لفظ بدنام نہ تھا بلکہ مجاہد اور وہابی دونوں لفظوں کا تقریباً ایک ہی مطلب لیا جاتا تھا"۲۔

۱۔ ایضاً صفحہ ۴۶۸ ۲۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۴۱

کانگرس کی بنیاد

امیر عبداللہؒ کے دور میں انگریز کو چونکہ ہر قدم پر مجاہدین نے ناک چنے چبوائے اس پر انگریز سازشوں پر اتر آیا۔ "چنانچہ اندرون ہند اس نے جہاں مسلمان علماء اور ان کے معاونین پر مقدمے قائم کئے وہاں ساتھ ہی ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگرس" کی بنیاد رکھی۔ جس کا ایک مقصد ہندوستان کی واحد قومی جماعت (کانگرس) بنا کر مسلمان کو کچلنے کے منصوبے سوچے جانے لگے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ انگریز اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے اور کہہ دے کہ ہندوستان کی قومی آواز ہی یہ ہے۔ گویا انگریز ہندو کے کندھے پر رکھ کر مسلمان کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔"[۱]

فتنہ قادیانیت

"جماعت مجاہدین" کے مشن کو کمزور کرنے کیلئے انگریز نے "کانگرس" کی بنیاد رکھی اور اسے ہندوستان کی نمائندہ جماعت قرار دے کر ہندوؤں کو ہر سمت آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حیثیت بالکل ختم ہو گئی' وہ نان شبینہ کے محتاج بن گئے۔ ہندو بنئے کی سودی ذہنیت نے مسلمانوں کی املاک گروی رکھ لیں جو فصل چھ ماہ بعد آتی وہ بنیا سمیٹ کر لے جاتا اور مسلمان آئندہ کے لئے بالکل قرضوں میں جکڑا رہتا۔ مولانا ظفر علی خاں نے غالباً ایک نظم لکھی تھی: "دہقان"۔ جو اس دور کے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کی صحیح عکاسی تھی:

؎ دہقان سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یاران وطن؟

کیا اب بھی ان کے سر پر قائم قرضہ ساہوکاری ہے؟ کیا اب بھی ان کی گردن پر سود کی تیز کٹاری ہے؟

جہاں مسلمانوں کو معاشی اور معاشرتی لحاظ سے مفلوج کرنے کیلئے "کانگرس" کا ڈول ڈالا گیا وہاں مسلمانوں کو مذہبی اعتبار سے دیوالیہ بنانے کیلئے مرزا غلام احمد کے ذریعے "فتنہ قادیانیت" (جھوٹی نبوت) کا حربہ اختیار کیا گیا۔ یہود و نصاریٰ آج بھی مسلم کے جہاد سے خائف ہیں۔ تاریخ گواہ ہے مسلمان جب تک " **واعدوا لهم ما استطعتم من قوة**

۱۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۴۴

ۃ ومن
رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" (الانفال ٦٠) کے فرمان الٰہی پر عمل پیرا رہا وہ دنیا میں کامراں و سرفراز رہا اور جب اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان " الجھاد ماض الی یوم القیامتہ " ۔۔ " جہاد قیامت تک جاری و ساری رہے گا' سے موہنہ موڑ لیا وہ ذلیل و رسوا ہوا۔ انگریز نے یہی چال چلی کہ مسلمانوں کو جہاد سے دور کر دیا جائے اور اس خاطر اس نے پنجاب کے علاقہ قادیان سے مرزا غلام احمد کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ " منسوخی جہاد " کی مہم چلا کر مسلمانوں کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرے۔

مرزا غلام احمد کا خاندانی پس منظر

مرزا غلام احمد کا خاندان پشت در پشت راجوں مہاراجوں کا ذلہ خوار چلا آ رہا تھا۔ اس خاندان نے ہمیشہ نوابوں اور مہاراجوں کی چوکیداری کے فرائض سرانجام دیئے۔ مرزا صاحب نے خود "کتاب البریہ" کے حاشیے میں لکھا ہے:۔

" میرے والد کو انگریزی حکام نے خوشنودی مزاج کی چٹھیاں دیں تھیں"۔ سر لیپل گرفن نے اپنی کتاب " تاریخ رئیسان پنجاب " میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کے اردو ترجمہ کا خلاصہ سید نوازش علی شاہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے الفاظ میں یہ ہے:

ا۔ " عطا محمد صاحب (مرزا کے دادا) اور ان کا والد گل محمد رام گڑھیا اور کنہیا مسلوں (سکھ جماعتوں) سے لڑتے رہے۔ آخرکار عطا محمد اپنی تمام جاگیر (جو انہیں انگریزوں کی فوجی خدمات کے عوض ملی تھی) کھو کر سردار فتح سنگھ اہلو والیا کی پناہ میں چلا گیا' جہاں بارہ سال امن و امان کی زندگی بسر کی"۔

۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی وفات پر اس کے بیٹے غلام مرتضٰی (مرزا صاحب کے والد) کو واپس بلا لیا اور آبائی جاگیر کا بہت بڑا حصہ واپس دے دیا۔ اس پر غلام مرتضٰی اپنے بھائیوں سمیت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں داخل ہوا اور کشمیر کی سرحد کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

۳۔ نونہال سنگھ' شیر سنگھ اور دربار لاہور کے دور دورے میں غلام مرتضٰی ہمیشہ فوجی

خدمت پر مامور رہا۔ ۱۸۴۱ء میں جرنیل نطورا کے ساتھ "منڈی" اور "کلو" کی طرف بھیجا گیا۔ ۱۸۴۳ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے معرکے میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ (ہزارہ کے مقدمے سے مراد تحریک مجاہدین کی مہمیں ہے) جسے سکھ اور انگریز حکومت مفسدے یا غدر یا بغاوت کا نام دیتی تھی)

۴۔ جب پنجاب کا انگریزوں سے الحاق ہو گیا تو خاندان کے دوسرے افراد کی جاگیر ضبط ہو گئی لیکن سات سو روپیہ کی پنشن غلام مرتضیٰ اور ان کے بھائیوں کو ملتی رہی۔

۵۔ اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء (تحریک آزادی ہند) کے دوران بہت اچھی خدمات سر انجام دیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کئے۔ اس کا بیٹا غلام قادر (مرزا غلام احمد کا بھائی) اس وقت جنرل نکلسن کی فوج میں تھا اس نے ۴۶۔ نیو انفنٹری (سیالکوٹ) کے باغیوں (سلطان فوجیوں) کو تہ تیغ کیا۔ جنرل مذکور نے غلام قادر کو ایک سند عطا کی جس میں درج تھا کہ ان کا خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام خاندانوں سے زیادہ نمک حلال ہے۔"

مرزا صاحب کو بھی خود اس "نمک حلالی" کا اعتراف تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں کتابوں کی ایسی پچاس الماریاں بھری پڑی تھیں جن میں انگریزوں کے قصیدے مرقوم تھے۔ مرزا صاحب خود رقمطراز ہیں:

i۔ "ہمارا جانثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے۔ ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں (اللہ کی راہ میں نہیں) اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔"

ii۔ "غرض یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ، نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے"[۱]

اس پس منظر کے ساتھ مرزا صاحب کی شخصیت اور فکری کاوشوں کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ انگریز نے مرزا صاحب کو اس کام پر مامور کیا کہ "جہاد" نے ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے اس کی منسوخی کی کوئی تدبیر کی جائے۔

۱۔ ملخص: از درخواست مرزا صاحب بحضور گورنر بہادر مورخہ ۱۸۹۸ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم مولفہ میر قاسم علی صاحب

مجدد، مسیح موعود ظلی یا بروزی نبی

مرزا صاحب نے ۱۸۸۰ء میں ملہم من اللہ اور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر اپنے الہام کا سہارا لے کر "جہاد" کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ظاہری عبادات کی پابندی کو نہایت لازمی قرار دیا تاکہ عام مسلمانوں کو گمراہی کا گماں نہ ہو۔ پانچوں نمازوں کے علاوہ "تہجد" کا پابند ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ داڑھی رکھنا فرض گردانا (خواہ وہ انگلش یا فرنچ کٹ ہی کیوں نہ ہو) جب علماء نے مرزا کے لتے لئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہاد کو نہ کسی عادل کا عدل اور نہ کسی ظالم کا ظلم منسوخ کرتا ہے، قیامت کے قریب جب حضرت مسیح آئیں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، تمام دنیا مسلمان ہو جائے گی تب جہاد منسوخ ہو گا۔ اس پر مرزا صاحب کو ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرنا پڑا اور ظلی و بروزی نبی کی اصطلاح ایجاد کرنی پڑی۔

لوگوں نے اعتراض کیا کہ حضرت مسیح تو آسمان سے اتریں گے اور منارۂ دمشق پر نازل ہونگے۔ تب نزول مسیح کا انکار کر دیا۔ وفات مسیح پر مستقل بحث شروع کر دی۔ قادیان کو دمشق بنایا اور وہاں "منارۃ المسیح" تعمیر کرایا اور زندہ انسان کے آسمان پر جانے کا انکار کر دیا۔ علماء نے کہا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات آسمان پر تشریف لے گئے تھے تو مرزا صاحب نے "جسمانی معراج" کا بھی انکار کر دیا۔ بہرحال مرزا صاحب کو پے بہ پے قلابازیاں لگانی پڑیں، نت نئے پینترے بدلنے پڑے، سچ ہے ایک جھوٹ چھپانے کیلئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ خانہ ساز نبوت کے لٹریچر سے چند اقتباسات نمونہ از خروارے کے طور پر نذر قارئین ہیں:۔

(i) "بعض احمق سوال کرتے ہیں کہ اس گورنمنٹ (انگریز) سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ سو یاد رہے کہ ان کا سوال نہایت حماقت کا ہے۔ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا؟ میں سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی آدمی ہی کا کام ہے" (شہادت القرآن۔ مرزا صاحب)

(ii) "اس سے بڑھ کر بے ایمان کون ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مسیح تو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کامیابی کے لئے دعا کرنی چاہئے اور یہ کہتا ہے کہ دعا کی کیا

ضرورت ہے 'انگریزوں کو شکست نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ (الفضل ۵ جون ۱۹۴۰ء)

(iii) " حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب ۔ بزعم خویش) نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹ عالیہ کی اطاعت اور وفاداری کو جزو مذہب قرار دے کر ہمیں ان منافق طبع مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا ہے جو ابھی انتظار میں ہیں کہ خونی مہدی ایک جرار لشکر لے کر آبدار تلواروں میں اور سیاہ و سرخ پرچموں کے ساتھ ظاہر ہو گا اور سب عیسائی سلطنتوں کو مٹا کر ایک نام سے مسلمانوں کو حکمران بنا دے گا۔ (الفضل ج ۴۰ صفحہ ۸۴ '۱۹۱۷ء)

(iv) " میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھ کو مسیح اور مہدی جان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے (اشتہار مرزا صاحب تبلیغ رسالت ہفتم)

(v) میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ برطانیہ فرض ہے اور جہاد حرام ہے (اشتہار ۱۰ ستمبر ۱۸۹۴ء تبلیغ رسالت سوم)

(vi) میں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمے یہ فرض کر رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا " (تبلیغ رسالت ج ۱۰ صفحہ ۷۶)

(vii) میرے پانچ اصول ہیں جن میں سے دو " حرمت جہاد " اور " اطاعت برطانیہ " بھی ہیں۔ (تبلیغ رسالت: صفحہ ۱۰۷)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز نے ان مجاہدین کو جو ہندوستان سے بے پناہ دولت بھیجتے رہے اور سپاہی بن کر جاتے رہے 'ان کا جوش ٹھنڈا کرنے کیلئے یہ کام کیا اور مرزا صاحب نے اس کام کو اس حسن و خوبی سے سرانجام دیا کہ جو کام انگریز کی قوت قاہرہ اور گولہ و بارود نہ کر سکا وہ مرزا صاحب کے افکار نے کیا۔ نتیجۃً ہمیں یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ مرزا غلام احمد انگریز کا ذلہ خوار 'اس کا خوشہ چیں اور حاشیہ نشین تھا بقول شورش مرحوم وہ انگریز کے ہاتھ کی چھڑی اور اس کی کلائی کی گھڑی تھی جدھر چاہے گھماؤ اور جس طرف چاہے چابی دے دو۔"

مولانا عبدالکریمؒ اور مرکز اسمست

نومبر ۱۹۰۲ء تا فروری ۱۹۱۵ء

مولانا عبداللہؒ کے بعد مولانا عبدالکریمؒ مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔ وہ آٹھ نو سال کے تھے جب اپنے والد ماجد مولانا ولایت علیؒ کے ہمراہ سرحد پہنچے تھے۔ ایک روز وطن لوٹ گئے۔ پھر ۱۸۶۱ء میں مولانا عبداللہ صاحب کے ہمراہ سرحد گئے' پھر ان کی زندگی کا ایک ایک لحہ وہیں بسر ہوا۔ جنگ امبیلہ سے (۹۸۔۱۸۹۷) جنگ بونیر تک نیز بعد کی تمام مہموں میں برابر کے شریک رہے۔ انہی کے دور میں مجاہدین کو ٹیلوائی چھوڑ کر" اسمست "کو مرکز بنانا پڑا۔ اسمست برونڈوندی کے عین کنارے پر واقع ہے جو بونیر سے نکلتی ہے اور کوہستانی علاقے کے نشیبی مقامات سے گزرتی ہوئی چملہ ندی سے مل کر دریائے سندھ میں گرتی ہے۔.... پشتو زبان میں "اسمست" غار کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس جگہ پہاڑ میں کئی چھوٹے بڑے غار ہیں' شاید اسی وجہ سے اس مقام کا نام "اسمست" پڑ گیا۔ مولانا عبدالکریم صاحبؒ نے یہ مرکز ۱۹۰۲ء میں قائم کیا۔ مولانا عبدالکریمؒ کے عہد امارت میں چھوٹی چھوٹی کشمکشیں ضرور ہوئی ہونگی مگر کوئی بڑی جنگ نہ ہوئی۔ اس دور میں ملک کے اندر خاصی سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ہر قابل ذکر طبقے کی آرزو یہ تھی کہ ملک کو اجنبی تسلط سے پاک کیا جائے۔ گویا سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء و معتقدین نے جس مقصد کا چراغ سوا سو سال پہلے جلایا تھا اس کی روشنی عام ہونے لگی تھی۔ جوش حمیت کی یہ پہلی لہر مسلم عوام میں ۱۸۹۵ء کی جنگ یونان و ترکی کے دوران پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ کم و بیش چار سو سال سے ترکی اسلامی خلافت کا گہوارہ تھا۔ حرمین شریفین کی خدمت کی سعادت بھی ترکوں کو حاصل تھی اور انگریز اسے ختم کرنے کے درپے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ جس وجہ سے مسلمانوں میں بہت سے سیاسی لیڈر بروئے کار آ چکے تھے جن میں مولانا محمد علی جوہرؒ' مولانا شوکت علیؒ' مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ' ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ اور مولانا ابو الکلام آزادؒ جیسے راہنماؤں کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ مولانا ابو الکلامؒ آزاد نے "الہلال

" کے ذریعے قرآنی دعوت کا سلسلہ ایسے دل پذیر انداز میں شروع کیا کہ وہ سیاسی لیڈر ہونے کے علاوہ وقت کے یگانہ دینی راہنما بھی سمجھے جاتے تھے اور آزادی وطن کی تحریک میں انہیں سبقت کا وہ مقام حاصل تھا جو عوام کی نظروں میں کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا ۔ مولانا عبدالکریمؒ ہر ضروری معاملے میں مولانا آزادؒ سے ہی مشورہ لیتے رہے ۔ مولانا عبدالکریم ۱۱ر فروری ۱۹۱۵ء (۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ) کو نماز فجر کے بعد " اسمست " میں اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ اسمست میں دفن ہوئے ۔ وہ اس قافلے کے آخری فرد تھے جس کے سرخیل مولانا ولایت علیؒ ' مولانا عنایت علیؒ اور مولانا عبداللہؒ رہ چکے تھے ۔ ان پر امارت کا وہ مقدس دور ختم ہو گیا جس کی ابتدا سید احمد شہیدؒ سے ہوئی تھی ۔ "

عطا اسلاف کا جذب دروں کر　　شریک زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

مولانا نعمت اللہؒ کا دور

۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء

مولانا عبدالکریمؒ کے بعد ان کے پوتے نعمت اللہؒ (جو مولانا مطیع اللہ کے فرزند تھے) بالاتفاق امیر منتخب ہوئے ۔ اسے غلط فہمی کہئے یا حالات کی ستم ظریفی کہ مولانا نعمت اللہ صاحبؒ کے زمانے میں جماعت مجاہدین کا مزاج انگریزی سامراج کے بارے میں نرم پڑ گیا ۔ بقول مولانا غلام رسول مہرؒ: " ہمارے سامنے جو بیانات آئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں انگریزی حکومت کے متعلق مسلک میں تغیر رونما ہو گیا ۔ اس سے تمام مخلص متوسلین کے دلوں میں خلش پیدا ہو گئی اور وہ سمجھنے لگے کہ جماعت مجاہدین اپنے اصل فرائض و وظائف سے ہٹ گئی ہے ۔ "[۱] احباب کا خیال تھا کہ امیر نعمت اللہ صاحب نے انگریزوں سے کچھ مفاہمت کر لی ہے جس کا قلق مجاہدین کو ضرور تھا ' پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جو اس صلح کی تائید کیلئے کافی تھے ۔ مولانا غلام رسول مہرؒ رقمطراز ہیں : " ان تفصیلات سے سب کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مصالحت یا مفاہمت کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو چکی تھی ۔ اغلب ہے کہ امیر نعمت اللہ

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۷۸

کا خیال یہی ہو کہ اس طرح ہندوستان سے مالی امداد حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی اور جو مجاہدین ان کے پاس تھے' وہ قلت تعداد اور بے سروسامانی کے عالم میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ رائے عین خلوص پر مبنی ہو تاہم ظاہر ہے کہ اصل معاملہ مجاہدین کی تعداد یا سروسامانی کا نہ تھا...... اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جماعت مجاہدین ایک سو سال سے ایک خاص مقصد اور خاص نصب العین کی حامل چلی آ رہی تھی۔ کروڑوں کی آبادی کے اس وسیع جنگل میں جو کراکرم سے راس کماری تک پھیلا ہوا تھا' جماعت مجاہدین کے سوا کون سا گروہ تھا جو اجنبی حکومت کی پرچھائیں سے بھی بیزار و متنفر ہوتا؟ امیر نعمت اللہ کے مجوزہ انتظام سے مجاہدین کے لئے اک گونہ سہولت کا بندوبست تو ضرور ہو گیا ہو گا لیکن اس طرح اس نصب العین کی آبرو کیا باقی رہ سکتی تھی جس کے لئے ہزاروں غیور جاں باز سرحدی کوہستانوں میں اپنا خون حیات بے دریغ بہاتے رہے۔ ہزاروں نے اہل و عیال اور اعزہ و اقربا سے دائمی مفارقت گوارا کی اور ہندوستان کے طول و عرض سے بے شمار روپیہ ہر سال سرحد پہنچتا رہا۔" [1]

مرکز چمرکنڈ

امیر عبدالکریمؒ اور امیر نعمت اللہؒ کے عہد میں جماعت مجاہدین کے لئے ملک بھر کے اندر وسیع پیمانے پر کام ہوا۔ اس عہد میں پنجاب کو نمایاں تقدم حاصل رہا جو مجاہدین کے علاقے سے بہت قریب تھا حالانکہ پہلے یہاں سرگرمی عمل کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالرحیم جو سرحد آزاد میں محمد بشیر کے اختیاری نام سے مشہور عالم ہوئے "اسمست" پہنچے اور انہوں نے پورے یاغستان میں مرکز "اسمست" کے تحت شاخیں قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا چنانچہ سرحد کشمیر سے وزیرستان تک ہر موزوں مقام پر چھوٹے چھوٹے مرکز قائم کر دیئے۔ مجاہدین کا کام یہ تھا کہ وہ آس پاس کے قبائل میں جہاد کی روح تازہ رکھیں اور وقتاً فوقتاً انگریزی علاقوں پر حملے کراتے رہیں۔ اگرچہ ان حملوں سے کوئی بڑا مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا تاہم ایک بدیہی فائدے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت جنگ یورپ کے محاذوں کے علاوہ سرحد پر بھی

---

[1] ایضاً ۴۸۱

توجہ جمائے رکھنے کیلئے مجبور ہوتی۔ نیز ان حملوں سے ہندوستان کی اس انقلابی تحریک کو یقیناً تقویت پہنچتی ۔۔ "ان میں سے چمرکنڈ کا مرکز باقی رہ گیا۔ جسے مولانا محمد بشیر صاحب کی وجہ سے ایسی شہرت نصیب ہوئی کہ جماعت مجاہدین کا اصل مرکز بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔ "اسمست" کا نام شاید گنتی کے اصحاب کو معلوم ہو' چمرکنڈ" کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ "۱۔ امیر نعمت اللہ کے دور میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوئیں جن میں رستم اور چک درہ کی لڑائیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی کہئے کہ لاہور سے جو چودہ طلباء مجاہد بن کے مرکز "اسمست" پہنچے تھے۔ انہوں نے جہاد کی ٹریننگ لی۔ ان میں سے ایک طالب علم محمد یوسف کو "امیر نعمت اللہ" نے اپنا معتمد خصوصی بنا لیا' اس نے ۴ر مئی ۱۹۲۱ء (۲۶ شعبان ۱۳۳۹ھ) امیر نعمت اللہ کو شہید کر دیا۔ "۲۔ محمد یوسف کو بھی مجاہدین نے وہیں آناً فاناً ختم کر دیا۔ غلام رسول مہرؒ نے شہادت امیر کے کوائف جمع کرتے ہوئے سچ لکھا ہے: "غصے اور رنج کا سبب یہ تھا کہ مصلحت آمیز مصالحت کے باعث نہ صرف جہاد کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی بلکہ ہندوستان کے اندر نظام اعانت کا سلسلہ بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ بہرحال حقیقی اسباب کچھ بھی ہوں اس رنج وہ صورت حال میں امیر صاحب کی جان بھی گئی جو بہت بڑے کارناموں کی صلاحیت رکھتے تھے اور ایک پر خلوص نوجوان کی زندگی بھی ختم ہوئی جو ملت کے اہم مقاصد میں بہ درجہا بہتر خدمات کا موجب بن سکتا تھا" ۳۔

مولانا رحمت اللہؒ کی امارت

۱۹۲۱ تا ۱۹۲۲ء

امیر نعمت اللہؒ کی شہادت کے وقت ان کے بڑے صاحبزادے برکت اللہ بہت چھوٹے تھے اور جماعت مجاہدین میں مولانا رحمت اللہ بن امان اللہؒ بن امیر عبداللہؒ کے سوا کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی امارت پر سب یا اکثر اصحاب متفق ہو جاتے۔ وہ امیر نعمت اللہ کے چچا زاد بھائی اور ان کے برادر نسبتی بھی تھے۔ بالا تفاق وہ امیر منتخب ہوئے۔ مولانا رحمت اللہ کے عہد امارت میں رزم و پیکار کا کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ پہلی

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۸۲ ۲۔ ایضاً صفحہ ۴۸۴ ۳۔ ایضاً صفحہ ۴۸۵

عالمی جنگ یورپ اور افغانستان کی تیسری جنگ کے دوران میں سرحد آزاد کے اندر جا بہ جا جو مرکز بن گئے تھے وہ آہستہ آہستہ ٹوٹتے رہے۔ صرف ایک چمرکنڈ کا مرکز باقی رہ گیا۔ یہ مرکز جماعت کے ممتاز رکن مولوی عبدالکریم صاحب نے قائم کیا تھا جو قنوج (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ (امیر عبدالکریم چمرقندی نہیں بلکہ یہ جماعت مجاہدین کے ایک پرانے رکن تھے جو غالباً ۱۹۲۲ء میں فوت ہوئے)"[1] کچھ مدت تک مولانا فضل الٰہیؒ وزیر آبادی یہاں عارضی طور پر امیر مقرر ہوئے۔ پھر اس کا انتظام مستقل طور پر مولانا محمد بشیر شہید کے حوالے کر دیا گیا اور اپنی شہادت تک کم و بیش چودہ برس وہی اس مرکز کے نظم و نسق کے ذمہ دار رہے۔ مولانا بشیرؒ نے سرحد پہنچتے ہی حکومت افغانستان اور وہاں کے بعض اکابر سے گہرے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ اس وجہ سے جماعت مجاہدین کو افغانستان میں خاص احترام حاصل رہا۔ غالباً ایک رقم بھی سالانہ ملتی تھی۔ خود مولانا بشیر صاحب کو جو کچھ ملتا تھا پورے کا پورا جماعت کی نذر کر دیتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مولوی برکت اللہ صاحب اور جماعت کے دس بارہ اصحاب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے تاکہ ارباب اختیار سے جماعت کا رشتہ براہ راست استوار کرا دیں۔ یہ ان کا آخری سفر ثابت ہوا واپسی پر انہیں شہید کر دیا گیا۔ مولانا رحمت اللہ کے دور میں دو اخبار بھی شائع ہوتے تھے 'ایک کا نام " الحرض " تھا۔ اس کی پیشانی پر یہ آیت درج ہوئی تھی " **یا ایھا النبی حرض المومنین علی القتال**" (اے نبی! مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلائے) (انفال: ٦٥)

دوسرا اخبار " الجاہد " کے نام سے ۱۹۴۰ء میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کی پیشانی پر یہ آیت ثبت تھی:۔

" **و لنبلونکم حتی نعلم المجاہدین منکم و الصابرین و نبلوا اخبارکم**" (اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے تاکہ جان لیں کون تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں اور کون ثابت قدم رہنے والے اور ہم تمہارے احوال کو جانچیں گے) (محمد: ۳۱)

آزادی کشمیر کے جہاد میں جماعت مجاہدین بھی شامل ہوئی تھی۔ امیر رحمت اللہ صاحب بھی کشمیر پہنچے اور جب تک لڑائی ملتوی نہ ہوئی برابر محاذ جنگ پر رہے۔ سرحد

[1] ایضاً صفحہ ۵۱۵

آزاد سے باہر آنے کا ان کیلئے یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔

مولانا محمد بشیرؒ (مولانا عبدالرحیمؒ)

۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۴ء

مولانا محمد بشیرؒ اگرچہ جماعت مجاہدین میں منصب امارت پر فائز تو نہ ہوئے تاہم ان کے مجاہدانہ کارناموں کی حیثیت اتنی بلند ہے کہ امیر نعمت اللہ اور امیر رحمت اللہ کے عہد کی پوری سرگزشت میں سب سے بڑا حصہ مولانا مرحوم کا ہی ہے۔ مولانا ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ جن حالات میں انہوں نے وطن چھوڑا وہ غالباً بہت کم اصحاب کو پیش آئے ہوں گے لیکن پوری مدت ہجرت میں ایک بھی مرتبہ یہ خیال نہ آیا کہ وطن واپس آئیں۔ مولانا غلام رسول مہرؒ لکھتے ہیں "میں نے ۱۹۳۴ء میں ایک مرتبہ ان سے عرض کیا تھا کہ اب ہندوستان سے باہر رہنے کے بجائے اندر رہ کر زیادہ مفید کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ سنا تو بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے فرمایا: "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم خلوص سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تو میں سمجھتا کہ تمہیں انگریزوں نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں جس دن گھر بار چھوڑ کر نکلا تھا، اللہ سے عہد کیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی سرزمین پر انگریز کا سایہ بھی موجود ہے خواہ اس کی حیثیت کچھ بھی ہو کبھی واپس نہ جاؤں گا اور اس سرزمین میں سانس لینا اپنے اوپر حرام سمجھوں گا، میں یہ عہد اپنے آخری دم تک نباہوں گا"

"غرض وہ ان عظیم الشان انسانوں میں سے تھے جو قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا مخلص، دین دار، باحمیت، غیور اور آزادی و اسلامیت کا شیدائی کوئی نہ دیکھا۔ استقامت میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے"۔ ۱؎

اصل نام عبدالرحیم تھا، سرحد پہنچنے پر محمد بشیر کے اختیاری نام کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو یاد رہا۔ ان کے والد مولانا رحیم بخش ضلع فیروز پور کے باشندے تھے۔ انہوں نے دہلی جا کر شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحبؒ سے حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ پھر لاہور آ گئے اور چینیاں والی مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام

۱؎ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۴۰

دیتے رہے ۔ مولانا عبدالرحیم صاحب (محمد بشیر صاحب) نے ایک دار الاشاعت قائم کیا جس کا نام "عبدالرحیم عبدالرحمٰن تاجران کتب" تھا۔ زندگی کا مستقل مشغلہ یہی تھا۔ لیکن جب جہاد کی غرض سے ہجرت کی تو پھر لوٹ کر نہ کاروبار کو دیکھا نہ بیوی بچوں کو حالانکہ "اس زمانے میں ان کے دار الکتب کا کام بہت اعلیٰ پیمانے پر پہنچا ہوا تھا۔ سینکڑوں کی آمدنی تھی۔ ان کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ بہ ظاہر کاروبار کے جاری رہنے یا بال بچوں اور اہل خاندان کا گزارہ چلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن مولانا نے سلطانی فرض کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ بعد میں انہیں برابر معلوم ہوتا رہا کہ بچوں کے گزارے کی کوئی اچھی صورت نہیں اور وہ سخت تکلیف میں ہیں تاہم انہوں نے اللہ سے جو عہد باندھا تھا اس کی پابندی میں فرق نہ آنے دیا اور

"**من المومنین رجال صدقوا ماعاهدوا الله علیه**" کی جیتی جاگتی مثال بنے رہے "۱

ے

مولانا محمد بشیر صاحب ؒ نے ۱۹۱۵ء سے کام شروع کیا۔ کالجوں کے طلبا فروری ۱۹۱۵ء میں جب سرحد جانے لگے تو ان کی روانگی کے مشورے مولانا بشیر صاحب کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ہم پہلے مرکز "چمرکنڈ" کا ذکر کر آئے ہیں مولانا کا مستقل قیام اسی مرکز "چمرکنڈ" میں تھا" جو ۱۶-۱۹۱۵ء میں قائم ہوا۔ مولانا محمد بشیر کی نظامت کے زمانے میں اس نے ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کے اصل مرکز "اسمست" کی شہرت بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ دیکھئے اللہ کی راہ میں خلوص و حسن نیت سے سرگرم عمل رہنے کی برکت و کرامت کہ پانچ سات چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں کی آبادی نے آزادی و اسلامیت کی تاریخ میں کتنا بلند مرتبہ حاصل کر لیا"۲۔

مولانا محمد بشیر صاحب ؒ کے کارنامے

"مولانا محمد بشیرؒ صرف اس امر پر قناعت نہ کر سکتے تھے کہ مجاہدین کو اپنے حلقے میں وقتاً فوقتاً جو لڑائیاں پیش آتی رہتی ہیں، ان کے لئے تنظیمات زیادہ بہتر صورت اختیار کر لیں یا جماعت کے افراد میں کسی قدر اضافہ ہو جائے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کے انسان تھے۔ سرحد پہنچتے ہی طے کر لیا کہ پورے آزاد علاقے میں جا بہ جا چوکیاں قائم کی جائی

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۴۳ ۲۔ ایضاً صفحہ ۵۴۸

چاہئیں تاکہ انگریزی مقبوضات پر ہر مقام سے مسلسل حملوں کا سلسلہ جاری ہو جائے اور یہ حملے صرف مجاہدین کی ٹولیوں تک محدود نہ رہیں جن کی تعداد بہرحال بہت زیادہ نہ تھی۔ مولانا حتی الامکان تمام آزاد قبائل کو ان سرگرمیوں میں اجتماعاً شریک کر دینے کیلئے مضطرب تھے اور اس غرض سے سرحد آزاد میں دورے شروع کر دیئے۔ جنگ یورپ (پہلی عالمی جنگ) شد و مد سے جاری تھی۔ ابتدائی دور میں جرمنوں کی کامیاب ترکتازیوں کے باعث محض برطانیہ ہی نہیں بلکہ تمام اتحادیوں کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ ہندوستانیوں کے لئے آزادی حاصل کرنے کا موقع اسی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا کہ جنگ میں انگریزوں کو شکست ہوتی۔ جب ترک انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جرمنی کے معاون بن گئے تو اسلامی نکتہ نگاہ سے بھی ہندوستان میں حد درجہ ضروری کام یہ تھا کہ انگریزوں کی مشکلات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاتا۔ اس کی صورت یہی تھی کہ سرحد پر جا بہ بجا خطرات کا طوفان برپا کر دیا جاتا تاکہ انگریز اپنی فوجوں کا بڑا حصہ سرحد کی حفاظت کے لئے رکھنے پر مجبور ہو جاتے اور باہر کسی محاذ پر کمک نہ بھیج سکتے۔ مولانا محمد بشیر کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کو کامیاب بنانے کیلئے وقف ہو گئیں۔ نتائج سے بحث نہیں لیکن مقصد کی تکمیل کے لئے مولانا نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جماعت مجاہدین کی تاریخ کے آخری دور میں اتنا بڑا اور وسیع الاثر کام صرف مولانا محمد بشیر صاحب جیسی عظیم المرتبت شخصیت ہی انجام دے سکتی تھی"[1]

شہادت

مولانا محمد بشیرؒ کو اپنی شہادت کا قبل از وقت احساس ہو چکا تھا۔ ان پر اس سے پہلے بھی دو قاتلانہ حملے ہو چکے تھے جن میں وہ بچ گئے تھے اوائل ستمبر ۱۹۳۴ء میں مولوی برکت اللہ بن امیر نعمت اللہ اور جماعت کے چھ سات آدمیوں کے ہمراہ کابل گئے تھے وہاں سے اواخر اکتوبر میں واپس آئے۔ رمضان مبارک کی پہلی رات اپنے کمرے میں شہید کر دیئے گئے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کی شہادت عبدالحلیم نامی ایک طالب

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۴۴

علم کے ہاتھوں ہوئی ۔ مولانا نے جس دن ہجرت میں قدم رکھا تھا وہ اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر چکے تھے لیکن کتنے رنج و قلق کا مقام ہے کہ جو بلند پایہ شخصیت دشمنان اسلامیت و آزادی کے خلاف جہاد کرتی ہوئی مرنے کی آرزومند تھی' وہ اپنوں کے ہاتھوں رمضان المبارک کی پہلی رات میں بہ حالت بے کسی ذبح ہوئی ۔ یقین ہے کہ مولانا کے جذبہ فداکاری کی زبان پر آخری وقت میں بھی یہ ترانہ ہو گا۔

؎ جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذری
شرمندہ از تو گشت کہ جان دگر نہ داشت

(آذری! ایک جان تھی سو تجھ پر فدا کر دی' تجھ سے شرمندہ ہوں کہ اس جان کے سوا دوسری جان نہ تھی ورنہ وہ بھی تجھ پر قربان کر دیتا۔)

مولانا محمد علی قصوری" کو کابل اور یاغستان میں مولانا محمد بشیر" کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا وہ ان کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں: "مولانا محمد بشیر" حیرت انگیز انسان تھے' انتظامی قابلیت اور سیاسی سمجھ بوجھ بے مثال تھی' انہوں نے کابل پہنچتے ہی امیر حبیب اللہ خاں کے مزاج میں اتنا عمل دخل پیدا کر لیا تھا کہ امیر صاحب نے ان کو یاغستان کی تنظیم پر مامور فرمایا اور بارہ ہزار روپے سالانہ تنظیمی اخراجات کیلئے دیئے۔" ۱؎ ...... ملا بشیر صاحب بھی ایک بے نظیر انسان تھے' مجسم عمل' خلوص کا پتلا' انگریز کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں مشاق' مقرر ایسے اعلیٰ درجے کے کہ بڑے بڑے مجمعے ان کی آتش بیانی سے مسحور ہو جاتے" ۲؎ ...... جماعت کے باا‌ثر حضرات میں سے امیر نعمت اللہ صاحب" کے بعد ملا بشیر تھے ...... جو واقعی حیرت انگیز انسان تھے' سلف صالحین کے سچے جانشین' ان تھک کارکن' مجسم عمل' ایثار کا پیکر' بے غرض' صحیح معنوں میں انقلابی لیڈر تھے انہیں دیکھ کر اقبال" کا مشہور شعر یاد آتا تھا:

؎ یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

امیر حبیب اللہ خاں نے ان کے کام سے خوش ہو کر بارہ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا وہ اس میں سے قوت لایموت رکھ لیتے غالباً پانچ روپیہ ماہوار اور باقی سارا بیت المال

۱۔۲؎ مشاہدات کابل و یاغستان صفحہ ۲۹۱ ۶۲-۶۱

میں جمع کرا دیتے تھے۔ ان کا اثر تمام یاغستان میں بے نظیر تھا۔ ہر قبیلے کے ملک اور شیوخ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ انہیں کی وجہ سے تمام علاقوں میں امیر نعمت اللہ کا خاصا وقار قائم ہو گیا تھا"۱۔

مولانا غلام رسول" لکھتے ہیں: "امیر جماعت مجاہدین کے جن حالات سے بعض دوسرے مخلص اصحاب پر برا اثر پڑا اور وہ نہ محض واپس چلے آئے بلکہ مجاہدین کا کام بھی چھوڑ دیا۔ وہ حالات مولانا محمد بشیر صاحب کو بھی پیش آئے اور یقیناً انہیں انتہائی رنج پہنچا ہو گا تاہم انہوں نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ مولانا کی پوری زندگی استقامت کی ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ مرکز مجاہدین کی بعض خرابیوں اور کمزوریوں کی بنا پر وہ نہ اصل کام سے دست بردار ہوئے اور نہ ہمت ہاری۔ افغانستان میں امیر حبیب اللہ کے تذبذب اور بے ہمتی نے ان کے ایک عظیم الشان منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا تاہم وہ پریشان نہیں ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک پیش نظر مقصد کے لئے تدبیریں سوچتے اور اسباب فراہم کرتے رہے۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے۔

؎ کارما باگردش طاس است و نقش کعبتین
باحساب انجم و کج بازی گردوں چہ کار

(ہمارا کام طاس کی گردش کے ساتھ ہے اور کعبتین کا نقش ہے ہمیں ستاروں اور آسمان کی کج بازی سے کیا تعلق۔)

مولانا فضل الٰہی"

۱۸۳۴ء تا ۱۹۵۱ء

"جماعت مجاہدین" کے ایک بہت بڑے کارکن مولانا فضل الٰہی" وزیر آبادی تھے۔ وہ ایک امیر اور کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا فضل الٰہی"، سید احمد شہید" کی پیدائش کے پورے ایک سو سال بعد پیدا ہوئے۔ سید احمد شہید" (یکم محرم الحرام ۱۳۰۰ھ) تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے اور مولانا فضل الٰہی ۲۷ رمضان المبارک جمعتہ المبارک ۱۲۹۹ھ میں چودھویں صدی کے آغاز سے صرف تین ماہ پہلے پیدا

۱۔ ایضاً صفحہ ۱۱۲، ۱۱۱

ہوئے۔ ۲۸ رجب ۱۳۷۰ھ (۵ مئی ۱۹۵۱ء) عمر عزیز کی ستر بہاریں دیکھ کر عالم فانی سے دار بقا کی طرف سدھارے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مسٹر سے مولوی تک

"وزیر آبادی" نسبت "وزیر آباد" شہر سے ہے۔ سکول کی تعلیم مشن سکول میں حاصل کی۔ والد صاحب میراں بخش صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ بچپن سے ہی نماز کے پابند تھے۔ کئی مرتبہ نماز پڑھنے کی وجہ سے ماسٹروں سے مار بھی کھائی۔ انگریزی بہت خوشخط لکھتے تھے۔ ایک دفعہ انسپکٹر آیا "لانگ مین" کی کاپیوں پر لکھی انگلش اور مسٹر فضل الٰہی کی لکھی ہوئی انگلش میں بہت دیر تک فرق تلاش کرتا رہا۔ نیلی کھدر کی تہہ بند اور آدھے بازوؤں والی کرتی (بھتوئی) میں ملبوس اس طالب علم کی اس "کرتوت" (خوشخطی) میں مناسبت تلاش کرتا رہا۔ ۱۹۰۰ء میں میٹرک کا امتحان بڑے اچھے نمبروں میں پاس کیا اور والد صاحب کی وساطت سے ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ جہاں ایک طرف مشن سکول میں انگریزی تعلیم جاری تھی وہاں ساتھ ساتھ حافظ عبدالمنان صاحبؒ سے عربی' فارسی اور دینی کتب کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ مولانا فضل الٰہی بہت ذہین تھے۔ اردو' عربی' فارسی اور انگریزی ان چاروں' زبانوں پر تو تعلیمی اعتبار سے بہت عبور تھا۔ ان زبانوں میں لکھنا' پڑھنا اور بولنا اس طرح آسان تھا جیسے مادری زبان پنجابی میں۔ پٹھانوں میں رہنے کی وجہ سے پشتو بھی مادری زبان کی طرح ہو گئی تھی۔ ان چھ زبانوں میں عبور کے علاوہ روسی' ترکی اور جرمنی بھی سمجھ لیتے تھے۔ حافظ عبدالمنان صاحب اگرچہ نابینا تھے مگر عقل و خرد کا چراغ روشن تھا۔ مجاہدین حافظ صاحب کے پاس قیام کرتے۔ یہاں سے وہ امدادی رقوم اکٹھی کر کے یاغستان چلے جاتے۔ مشنری سکول کے تعلیم یافتہ نوجوان مسٹر فضل الٰہی اور ریلوے کے بابو فضل الٰہی کو ان مجاہدین کی خدمت کا موقع ملا۔ حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس قرآن بھی حفظ کر چکے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ریلوے کی ملازمت کو خیر آباد کہہ کر یہ مسٹر فضل الٰہی ہمیشہ کے لئے مولانا فضل الٰہی کی صورت اختیار کر گیا۔ انہیں انگریز سے سخت نفرت تھی۔ ایک دن والد صاحب نے حافظ عبدالمنان صاحب سے شکایت کی کہ فضل الٰہی نہ ملازمت کرتا ہے نہ کاروبار۔ اس کے مہمان بہت

آتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ حافظ عبدالمنان صاحب نے جواب دیا "میرے چار لڑکے ہیں، چاروں لے لو اور فضل الٰہی مجھے دے دو، تمہیں کیا قدر کہ یہ کیا چیز ہے۔؟ ۔۱

امیر المجاہدین ہند

مولانا عبدالکریم صاحبؒ نے ۱۹۰۲ء میں امیر منتخب ہونے کے بعد اپنا مرکز "اسمست" بنا لیا اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور لیڈروں سے تعلقات قائم کئے۔ "مولانا فضل الٰہیؒ ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں "اسمست" پہنچے۔ امیر عبدالکریم کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ ہندوستان جا کر جماعت کے لئے چندہ امدادی فراہم کرتے رہیں۔ وہ پہلے ہی بطور خود یہی کام کر رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ملازمت ترک کر دی اور جماعتی کاموں کے لئے وقف ہو گئے۔ وہ چپ چاپ ملک کے طول و عرض میں پھرتے رہتے تھے۔ تمام ممتاز ملکی رہنماؤں سے گہرے تعلقات پیدا کر لئے۔ ان میں بطور خاص قابل ذکر مولانا ابوالکلامؒ آزاد ہیں جن کی دینی دعوت نے "الہلال" کے ذریعے سے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ مولانا فضل الٰہیؒ نے اس دوران میں ہزاروں روپے فراہم کئے اور اپنے ساتھ مخلص کارکنوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر لی۔ جس کے افراد فراہم کردہ روپیہ اور آدمی اسمست پہنچاتے تھے۔ ۔۲ "ہندوستان میں قائم مرکزوں کو یک جہتی میں منسلک کرنے کے لئے غالباً ۱۹۰۶ء میں مولانا فضل الٰہیؒ صاحب کو "امیر المجاہدین" ہند کا عہدہ تفویض ہوا۔ ۳

سوئے زنداں

مولانا فضل الٰہیؒ جو کام کر رہے تھے، وہ سہل نہ تھا۔ "قدم قدم پر قسم قسم کے خطرات درپیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مولانا فضل الٰہیؒ کی سرگرمیاں انگریزوں کی خفیہ پولیس کے علم میں آگئیں۔ انہیں گرفتار کر کے جالندھر جیل میں بند کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کا نشہ ایسا نہ تھا جسے اسیری کی ترشی اتار سکتی۔ انہوں نے جیل میں ولی محمد نامی ایک وارڈن کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور اسی کے ذریعے سے تمام رفیقوں کو سرگرمی سے کام

۱۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۶۳ ۲۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۶۸ ۳۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۶۴

جاری رکھنے کی تحریری ہدایتیں دیتے رہے ۔۱ باقی حصہ آباد شاہ پوری کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے :۔

"گوہر شاہوار

زمانے کی گردش چار سال پیچھے پہنچ گئی ہے ۔ جالندھر جیل میں وزیر آباد کا ایک نوجوان بند ہے ۔ عمر تیس بتیس کے لگ بھگ' متوسط قد' بلند پیشانی' عقابی ناک' دل میں کھب جانے والی نگاہیں گورا چٹا رنگ' لمبی سیاہ داڑھی' چہرے پر سے جیل کی مصیبتیں صاف جھلک رہی ہیں' لیکن اپنی دھن کا پکا اور عزم و ہمت کا پہاڑ۔ نوجوان کا جرم یہ ہے کہ مجاہدین کی تحریک کو روپے اور آدمی فراہم کرتا ہے ۔ اٹھارہ سال کا تھا جب اس تحریک سے وابستہ ہوا ۔ بیس سال کی عمر میں تحریک کے مرکز "اسمست" گیا اور امیر المجاہدین کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی ۔ ان دنوں ریلوے میں ملازم تھا۔ نچلے اور متوسط طبقے کے کسی مسلمان نوجوان کے لئے نوکری حاصل کرنا پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہ تھا مگر اس نے ملازمت کو لات ماری اور اپنی ساری زندگی حق کی راہ میں وقف کر دی اور واقعی یہ نوجوان گوہر شاہوار نکلا ...... ۷ نومبر ۱۹۱۵ء کو پولیس اسے گرفتار کرنے وزیر آباد پہنچی تو یوں لگتا تھا جیسے اس کا سامنا کسی بڑی ہی انقلابی شخصیت سے ہو۔ پولیس کی کمان انگریز سپرنٹنڈنٹ کر رہا تھا ۔ نوجوان نے تھوڑی ہی دیر پہلے ملک کے مختلف ممتاز افراد کو خط لکھے تھے ۔ پولیس نے ان پر فوراً قبضہ کر لیا ۔ دو خط ان کی نظر سے چوک گئے ۔ نوجوان نے اشارہ کیا اور اس کے والد نے پولیس کی نظر بچا کر انہیں اٹھا لیا' گول کر کے کھا گئے ۔ ان میں سے ایک خط مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور دوسرا مولانا ابوالکلام آزاد" کے نام تھا ۔ ۲

"جیل میں بھی نوجوان کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ آئی ۔ تحریک کا کام وہ اب بھی کر رہا ہے ۔ قیدی ساتھی جیل کے کارندے اس کے کردار سے متاثر ہیں ۔ یہ انہیں قرآن و سنت کی پیروی کی تلقین کرتا رہتا ہے ۔ وارڈن ولی محمد تو اس کا بہت عقیدت مند ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک کا رکن بن چکا ہے ۔" نوجوان اس کی وساطت سے جیل کی چار دیواری سے باہر ہر علاقے کے ممتاز افراد کو ہدایت دیتا رہتا

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۶۹ ۲۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۳۸۲

ہے۔ سوئے اتفاق سے ایک تحریر پکڑی گئی۔ ولی محمد نے مصیبت سر پر آتے دیکھی تو تمام راز افشاء کر دیئے۔ جن جن رفقاء تک وہ تحریریں پہنچتی تھیں انکے نام پتے بھی بتا دیئے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

سوئے دار

"نوجوان پر بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے۔ جس کی سزا موت ہے۔ جیل میں اس پر بے تحاشا ظلم ڈھائے جاتے ہیں چلچلاتی دھوپ میں دن بھر کھڑا رکھتے ہیں۔ اس کا جسم جھلس گیا ہے۔ رنگ سیاہ اور آنکھیں خراب ہو گئی ہیں برطانوی حکومت اسے پھانسی دلوانے کا پورا انتظام کرتی ہے مگر زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ مقدمے کی سماعت جو فوجی عدالت جیل ہی میں کرتی ہے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود جرم ثابت نہیں ہوتا۔" ۱

دوران جیل انکے والد ماجد ۱۹۱۸ء میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثے نے مولانا صاحب کے گھر کا باقی نظم و نسق درھم برھم کر ڈالا۔ چنانچہ مجبوراً ایک سال کے لئے تین ہزار روپے کی ضمانت دے کر اس شرط پر رہا ہوئے کہ وزیر آباد سے باہر نہ جائیں گے۔ شدید پابندی کی اس مدت میں بھی انہوں نے جماعت مجاہدین کا کام جاری رکھا اور اس میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ حالانکہ ان کے لئے خطرات بہت بڑھ گئے تھے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

"وہ انتھک اور سراپا عمل انسان ہے۔ ضمانت کی میعاد ختم ہوتی ہے تو اپنے مقصد زندگی کے عشق میں ڈوبا پھر دوروں پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ صبح کہیں ہوتی ہے شام کہیں۔ قدم قدم پر خطرہ ہے۔ دشمن اس نقش قدم کی بو سونگھتا پھرتا ہے مگر وہ ہر خطرے کو انگیز کرتے ہوئے تحریکی دورے جاری رکھتا ہے۔ اب کے اس نے نیا روپ دھارا ہے۔ تین

۱۔ ایضاً صفحہ ۵۸۳

ساتھیوں سے مل کر چاقو چھریاں بنانے والی فرم بنا لی ہے اور سپلائی کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے ۔ وہ فرم کی مصنوعات کا ایک سمپل بکس ساتھ رکھتا ہے ۔ جس شہر میں جاتا ہے دوکانداروں کی فرمائش بھی بک کرتا ہے اور جماعت کا کام بھی ۔ فضل الٰہی اسی نوجوان کا نام ہے "..... سوئے اتفاق جون ۱۹۲۰ء میں قاضی کوٹ سے اسلحہ برآمد ہونے کی اطلاع ملی تو مستری ابراہیم صاحب کے بیان کے مطابق مولانا فضل الٰہی نے فرمایا ' اب زندگی کا خاتمہ ہے ۔ جہاں مجھے اپنے بچاؤ کا موقع ملے گا وہاں چلا جاؤں گا ۔ جب گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو آپ رتلام میں تھے ۔ وہاں آپ کو اطلاع ملی تو آپ رتلام سے احمد آباد ۔ جودھپور ' حیدر آباد اور سکھر ہوتے ہوئے کوئٹہ پہنچے ۔ جیسے جیسے بلوچستان کے قریب پہنچتے گئے انہوں نے دیکھا کہ پولیس کی نگرانی بڑھتی جا رہی ہے ۔ جنکشنوں پر خفیہ پولیس کے آدمی خاصی تعداد میں متعین ہیں ۔ ایک جنکشن پر وہ گاڑی میں داخل ہو کر مولانا کو تلاش کرنے لگے ۔ مولانا نے خطرہ کو بھانپ لیا ۔ گاڑی سے اتر کے سامنے پلیٹ فارم پر قلیوں کے ساتھ حقہ پینے لگے ۔ اگرچہ حقہ کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا ۔ گاڑی کی پڑتال ہو گئی تو مولانا پھر گاڑی میں سوار ہو گئے ۔ کوئٹہ سے براستہ سکھر ملتان جانے کے لئے سوار ہوئے ۔ شیر شاہ جنکشن پر اتر گئے کہ بڑے شہروں میں خفیہ پولیس کے تعاقب کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے ۔ یہاں گاڑی بدلی ۔ براستہ کندیاں کیمبل پور پہنچے ۔ اسی اثناء میں ہزاروی ہم سفر نے دغا دیا ۔ دو ہزار روپیہ اور ٹکٹ اسی کے پاس تھے ۔ " مولانا خالی ہاتھ رہ گئے ۔ اللہ کا نام لے کر پیدل ہی ہری پور ہزارہ کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔ ہری پور سے دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ڈھیری ہے ۔ یہاں مجاہد بھائی مولوی محمد اسماعیل رہتے تھے ان کا گھر گویا ایک طرح کا سفری کیمپ تھا ۔ مولوی صاحب کی منزل مقصود بھی یہی پڑاؤ تھا ۔ پہاڑی راستہ سخت دشوار گزار تھا اس پر بھوک اور پیاس نے نڈھال کر دیا ۔ دو دن سفر کرتے ہو چلے تھے ۔ دوپہر کے وقت ایک بوڑھا کسان اپنے کھیتوں میں درخت کے نیچے بیٹھا نظر آیا ۔ مولوی صاحب نے اس کے پاس جا کر پانی مانگا ۔ اس نے پوچھا کون ؟ فرمایا ۔ درویش ۔ مسافر کہاں جا رہے ہو ؟ ہری پور ۔ نقاہت کی وجہ سے آواز بمشکل نکل رہی تھی ' زمیندار نے پوچھا ۔ آپ بھوکے تو نہیں ؟ مولوی

صاحب نے فرمایا "دو دن سے بھوکا ہوں" بوڑھے نے انہیں پانی پلایا اور روٹی بھی کھلائی ۔ چوتھے دن ڈھیری پہنچے تو پاؤں سوج کر پھٹ چکے تھے "۔[1] غالب نے سچ ہی تو کہا تھا:۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

راہ خدا میں سنت رسول ﷺ کی قربانی

"کوئٹہ پہنچنے کے بعد مولوی فضل الٰہی سرحد پار کرنے کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں لگ گئے ۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا مرحلہ تھا۔ سرحدی محافظ خبردار کئے جا چکے تھے ۔ کوئٹے میں چپہ چپہ پر خفیہ پولیس آنے جانے والوں کی نگرانی کر رہی تھی ۔ یہاں تک کہ فرود گاہ سے باہر قدم رکھنا بھی خطرے سے خالی نہ رہا۔

ایک دن غسل کرنے شہر کے مضافات میں تشریف لئے گئے ۔ پل ذرا نشیب پر تھا۔ اترنے کے لئے نیچے دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئے ۔ سی آئی ڈی کا انسپکٹر جو جالندھر میں ان پر متعین تھا نل کے نیچے بیٹھا نہا رہا تھا الٹے پاؤں واپس آگئے ایسا معلوم ہوتا تھا حکومت نے چاروں طرف مکمل جال بچھا دیا ہے جس سے بچ کر نکلنا آسان نہ تھا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے ۔ مولانا صاحب کی داڑھی بڑی لمبی تھی ۔ اپنے ہم سفر سے کہا "میری داڑھی تراش کر چھوٹی کر دو" توبہ توبہ اس نے جواب دیا ' حضرت مجھ سے تو یہ گستاخی نہیں ہو سکتی ۔ مولانا صاحب نے قینچی اور شیشہ گٹھری سے نکالا ۔ خود داڑھی چھوٹی کی ' کٹے ہوئے بال ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا "میرے مولا ! یہ بال تیرے نبی ﷺ کی سنت سمجھ کر تیری رضا کے لئے رکھے تھے ' اب تیری رضا ہی کے لئے کاٹ رہا ہوں" پھر بال اسی درخت کے نیچے دفن کر دیئے ۔ پہاڑوں اور جنگل سے گزرتے پا پیادہ کوئٹہ سے پچھلے سٹیشن پر آئے ۔ گاڑی میں سوار ہوئے اور سکھر کے راستہ ملتان روانہ ہو گئے "۔[2]

ترک وطن سنت نبوی ﷺ ہے

انہی دنوں مولانا فضل الٰہیؒ ہجرت کر کے یاغستان چلے گئے اور اپنے بال بچوں کو بھی وہیں

۱۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۳۸۶ ۲۔ سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۳۸۷

بلالیا۔ "اسمست" سے پھر یکم ذی الحج ۱۳۳۸ھ (۱۷ اگست ۱۹۲۰ء) چمرکنڈ منتقل ہو گئے اور ہجرت کی بقیہ مدت وہیں بسر کی۔ چمرکنڈ کی جماعت کے امیر مولانا عبد الکریمؒ کا انتقال ہوا تو مولانا بشیرؒ براہ وزیرستان گئے ہوئے تھے۔ جماعت نے عارضی طور پر مولانا فضل الٰہی کو امیر منتخب کرلیا۔ مولانا بشیرؒ واپس آئے تو مرکز "اسمست" کی ہدایت کے مطابق وہ مستقل امیر بن گئے۔ ہجرت سے کچھ ہی مدت بعد مولانا فضل الٰہیؒ کی والدہ ماجدہ اور بھائی محمد الٰہیؒ کا انتقال ہو گیا لیکن ان حوادث پر بھی انہوں نے ہندوستان آنا گوارا نہ کیا اور اپنے فیصلہ ہجرت پر مستقیم رہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

مولانا فضل الٰہیؒ بڑے فعال اور عملی انسان تھے۔ انہوں نے مرکز چمرقند کے انتظامات کا گہرا مطالعہ کیا۔ جو جمود طاری تھا اسے ختم کرکے ترقی کے منصوبے بنائے۔ ان میں خصوصاً مجاہدین کے بچوں کے لئے چمرکنڈ میں ایک بہت بڑے دینی مدرسہ (جامعہ اسلامیہ) کا پروگرام بنایا۔ ایک بہت بڑی لائبریری بنانے کا ارادہ کیا۔ ایک فری ہسپتال بنانے کا منصوبہ بنایا، پندرہ روزہ "المجاہد" جاری کرنے کا سامان مہیا کیا۔ ایک اسلحہ ساز فیکٹری بنانے کی تجویز کی جس میں نئی ساخت کا جدید اسلحہ تیار کیا جانا مقصود تھا اس کے علاوہ کپڑے وغیرہ کے کارخانے لگا کر جمعیت کے افراد کو خود کفیل بنانے کا پروگرام طے کیا تاکہ روز روز کے چندہ مانگنے سے نجات ملے۔ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ نے ۳۲ ہزار روپیہ کا سامان خرید کیا اور مختلف فنون کے ماہرین منگوائے۔ خود پشتو سیکھ کر تعلیم دینا شروع کی۔ آپ کے پاس سولہ طالب علم زیر تعلیم تھے لیکن

؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ....

مولانا مرحوم نے خود اپنی بیاض میں لکھا ہے:۔

"انہی دنوں ایک حادثہ پیش آیا کہ اکبر نامی ایک آدمی روس کی طرف سے آیا اور ہمارے جامعہ اسلامیہ میں پوشیدہ طور پر عقائد کفریہ کی اشاعت کرنے لگا۔ جب وہ چمرقند میں آیا تو اس کے ساتھ عطاء اللہ خان اور عبد الوحید خان دو انگریزوں کے جاسوس بھی

تھے۔ محمد اکبر چمرکنڈ سے ہندوستان کی سیاحت کے ارادے سے چلا گیا اور اکبر کو پکڑنے کے بہانے سے عطاء اللہ بھی دفعتہ غائب ہو گیا۔ ادھر پشاور سے ہمارے کارخانوں کا سامان مشینری وغیرہ لے کر اونٹوں کا قافلہ آرہا تھا۔ جن کے پاس اٹھارہ (۱۸۰۰۰) ہزار روپیہ بھی تھا۔ چنانچہ ہمارے تمام آدمی عطاء اللہ خان کی مخبری سے گرفتار ہو گئے اور ایک سال سے لے کر اکیس سال تک سزا یاب ہوئے اور مشینری اور رقم سب ضبط ہو گئی۔ ہمارے آمدورفت کے راستے جو کافی بے خطر' آزاد اور برطانوی حکام کی توجہ کا مرکز نہ تھے اور ہمارے آدمیوں کی آمدورفت بالکل آزاد تھی محمد اکبر کی وجہ سے زیر قانون ناکہ بندی آگئی اور ایک سو آدمی خفیہ پولیس کا ان راستوں پر متعین کر دیا گیا۔۔ کتنی پر مصائب ہیں یہ راہیں۔۔ ۱

امارت

مولانا بشیر صاحب" کے ذمہ چونکہ وزارت خارجہ کی ذمہ داریاں تھیں اس لئے وہ اکثر افغانستان (کابل) ہی رہا کرتے تھے۔ جس وجہ سے مجاہدین کی موجودگی میں جماعت کی امارت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ " قرآن مجید کو سات مرتبہ شفیع اور سفارشی بنا کر مولوی فضل الٰہی صاحب" کی امارت پر راضی ہو گئے اور آئندہ جمعیت مجاہدین کے پاس پوری خیر خواہی کا اقرار کیا۔ یہ معاملہ ۲۷ رمضان ۱۳۴۰ھ (مارچ ۱۹۲۲ء) کو طے پایا۔ ۲

ان کے صاحبزادے مولانا سلیمان صاحب" کے بیان کے مطابق آپ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۸ء تک یقینی طور پر مرکز چمرکند کے امیر المجاہدین رہے۔ بعد میں یہ امارت پھر مولوی بشیر صاحب" کو منتقل ہو گئی۔ ۳۰-۱۹۲۹ء کا دور مولانا کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا کیونکہ ایک طرف تو مولانا کے دست راست صوفی عبد اللہ صاحب" "مدرسہ اوڈانوالہ" کی تاسیس کی کوشش فرما رہے تھے اس لئے سرحد میں جانا اتنا ہی کم ہو رہا تھا اگرچہ اس کی تلافی غازی عبد الکریم خاں صاحب سے ہو گئی۔ لیکن پھر بھی غازی صاحب ابھی نو عمر تھے اور ابھی نئے نئے ہی حضرت صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بہت بہترین کارکن ثابت ہوئے۔۔ ۳

اس دوران مولانا فضل الٰہی صاحب" تمام سرحد میں دورے کرتے رہے اور آزاد

۱۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۶۸-۱۶۷   ۲۔ ایضاً صفحہ ۱۷۳   ۳۔ ایضاً صفحہ ۱۸۲

سرحدی لوگوں کو انگریز کی مخالفت پر اکسایا کرتے اور آزاد علاقوں میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے مرکز بناتے رہے اور بدستور اس کی اطلاع حکومت افغانستان کو باقاعدہ فراہم کرتے رہے۔

انقلاب افغانستان

سردار محمد شفیع صاحب کے فرمان کے مطابق ۱۹۲۹ء میں مولانا فضل الٰہی صاحب ؒ نے ملا سنڈاکئی بابا سے مل کر ایک منصوبہ بنایا جو کہ حکومت انگلشیہ ہند اور افغانستان کے درمیان ایک آزاد ریاست ہو جو انگریزوں سے جہاد کرتی رہے جس کی وجہ سے افغانستان کے ساتھ تعاون حاصل کرنے کے باوجود کسی قسم کی حرف گیری نہ ہو سکے کیونکہ حکومت افغانستان کھل کر انگریزوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس منصوبہ کو عملی شکل دینے کے لئے مولانا فضل الٰہی اور ملا سنڈاکئی بابا دونوں افغانستان گئے۔ امیر امان اللہ کو اعتماد میں لیا۔ امیر امان اللہ نے پانچ صد رائفل' بہت سے کارتوس اور دس لاکھ روپیہ کا وعدہ کیا۔ مولانا فضل الٰہی نے خود لکھا ہے کہ ہمارے بار برداری کے گھوڑے ابھی کابل کے نصف میں تھے کہ معلوم ہوا کابل میں بچہ سقہ کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔

جنرل نادر خاں نے فرانس سے آکر بچہ سقہ کی بغاوت فروکی اور اسے قتل کر دیا۔

دوسری طرف شب قدر کے راستے انگریزی فوج علاقہ سنڈاکئی' دریائے *بجکوڑہ پر پل بنا کر وہاں اپنی چوکی قائم کرنا چاہتی تھی۔ مولانا فضل الٰہی نے آزاد قبائل کو اکٹھا کر کے اس کا یہ منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ آپ نے انگریزی تھانہ پر شب خوں مار کر پل تباہ کر دیا اور انگریز فوج کو پسپا ہونا پڑا۔

انگریز نے محسوس کر لیا کہ جب تک آزاد قبائل میں مولانا فضل الٰہی ؒ کا وجود ہے امن اور سکون نہیں رہ سکتا جنرل نادر شاہ کی معرفت چمرکنڈ پیغام بھجوایا گیا اگر آپ فرمائیں تو میں حکومت سے سفارش کر کے آپ کو اپنے وطن (وزیر آباد) بھجوا دیتا ہوں لیکن مولانا نے اسے قبول نہ فرمایا۔ پھر نادر شاہ نے پیغام بھیجا کہ اگر اپنے وطن مالوف لوٹنے کا ارادہ نہیں تو یہاں میرے پاس افغانستان آجائیں میں آپ کی گذران کے لئے ستر جریب زمین اور وظیفہ مقرر کردوں گا۔ مولانا نے اس پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا۔ جب یہ

حربے کامیاب نہ ہوئے تو انگریز نے مولانا فضل الٰہی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جب اس حربے میں کامیاب نہ ہو سکا تو انگریز نے مولانا محمد بشیر صاحب مرحوم کو قتل کر کے اس کا الزام مولانا فضل الٰہیؒ پر لگانے کی کوشش کی مگر مولانا کو اللہ تعالیٰ نے ایسے الزام سے بچا لیا۔ ۱۰۱

صبرو استقامت

مولانا فضل الٰہی کو بہت دفعہ یہ پیش کش ہوئی کہ اگر آپ وطن واپس جانا چاہیں تو انگریز سے اس کی گارنٹی بھی لی جا سکتی ہے مگر مولانا مرحوم نے ہر دفعہ ایسی پیش کش کو ٹھکرا دیا اس کی وجہ اور آخر اس کا سبب کیا تھا؟ آپ نے جو خط شاہ افغانستان کو ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا خود اس سوال کا جواب دیتے ہیں:

"اب سوال یہ ہے کہ سب کیوں اور کس لئے ہے؟ یہ سب صرف اس لئے ہے کہ آزادی وطن کی جنگ میں میں اور میرے رفقائے کار اللہ اور رسولؐ کے نزدیک کسی سے کم نہ رہ جائیں۔ ہندوستان کی مسلم قوم کا رویہ ہندوستان کی دوسری آزادی خواہ جماعتوں کی نظر میں کم مقدار نہ پائے۔ اسلاف رحمھم اللہ کی عدیم النظیر اور لازوال قربانیوں کی روایات کا شان دار ریکارڈ جس کی حضرت سلطان ٹیپو رحمتہ اللہ علیہ سے ابتدا ہوئی اور جس کا سلسلہ حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد اسماعیلؒ مولانا عبد الکریمؒ بن ولایت علیؒ کے واسطہ سے مجھ نا اہل تک پہنچا، ٹوٹنے نہ پائے۔ ماضی کی طرح حال اور مستقبل میں بھی بدستور مشعل راہ بنا رہے یہ وہ حضرات ہیں جن کے سوانح حیات کی ہر زمانے کے مورخوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی ہے۔"

اس مقصد اور مشن کے لئے مولانا فضل الٰہیؒ نے ہر درد اور مصیبت کو مردانہ وار گلے سے لگایا۔ نہ ماں باپ کی پرواہ کی، نہ اولاد کی، نہ جان و مال کی لکھتے ہیں:.... ان تمام مصائب کو بطیب خاطر قبول کرتا رہا اور کر رہا ہوں اور کسی کمزوری کے اظہار کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ جوں جوں دشمنوں کی کثرت اور ان کی پشت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جاتی ہے ویسے ہی اس خالق بندہ نواز کی تائید غیبی سے میرے عزائم میں پختگی کی روح پیدا ہوتی ہے اور میرے رفقائے کار کی روئیں روئیں سے صدائے حوصلہ افزا: فماوھنو الماا صا

۱۰۱ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۱۹۱

بھم فی سبیل اللہ و ما ضعفوا و ما استکانوا (آل عمران = ۱۴۶) ہر گوش ذی ہوش میں پہنچتی رہی ۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے ۔ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی ۔ وہ باطل کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے' وہ ان تمام سر گردانیوں اور پریشانیوں کو اعلیٰ ترین روحانی غذا اور خدائے بے نیاز کے نہایت قیمتی تمغے سمجھتے ہیں اور حسب حال یوں کہہ کر مجھ کمزور کو صبر کی تلقین کرتے ہیں:

ے ماکشتہ عشقیم' محبت کفن ماست   پروردہ دردیم مصیبت وطن ماست

ہم عشق کے مارے ہوئے ہیں ہمارا کفن محبت ہے ۔ ہم درد کے پالے ہوئے ہیں ہمارا وطن ہمارے لئے مصیبت ہے ۔

ے زاھد تو برد طوطی فردوس بریں باش   مابلبل آن باغ کہ دوزخ چمن ماست

زاہد فردوس بریں کے طوطی بن کر راحت و آرام کے مزے لوٹو' میں ایسے باغ کا بلبل ہوں کہ دوزخ میرا چمن ہے ۔

ے ماکار نداریم بایں آتش دوزخ
چوں نام محمدؐ ہمہ دم در دھن ما است

مجھے دوزخ کی اس آگ سے کچھ سروکار نہیں اس لئے کہ مری زبان پر ہردم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی جاری رہتا ہے ۔ [۱]

مولانا فضل الٰہی نے ہر آزمائش میں پہاڑوں جیسے ثبات کا مظاہرہ فرمایا :۔ بے شک میرے بڑھاپے اور ضعف پیری' جسمانی کمزوری اور میری سفید داڑھی کا تقاضا یہی تھا کہ میں خدا کا بندہ غریب الوطنی کی زندگی کے باقی ایام خاندان شاہی کے زیر سایہ خدا کی یاد میں بسر کر دیتا ۔ لیکن ایسی حالت میں کہ موت سر پر ہے' ایک رات رہ بھی جاؤں تو دوسری رات شاید نہ رہوں گا ۔ فہم و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اس آخری عمر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور خدمت قوم و وطن کے راستے سے منہ پھیر کر آسودگی اور لذت یابی کی طرف التفات نہ کروں ۔ دنیا گذر جانے والی ہے اور اسے یقیناً چھوڑ کے چلے جانا ہے ۔ اس دنیائے فانی کی آسائش پر میرا مائل ہو جانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا میرے لئے لائق صد حیف و افسوس ہے' یہ تو گویا خاک میں مدفون اپنے ساتھیوں کو

---

۱ ۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۲۲۶-۲۲۵

دغا دینا ہے .... رہے مصائب و شدائد (جن سے چھٹکارا دلانے کے لئے یہ پیش کشیں کی جا رہی ہیں) تو اگر میرے جسم کا ہر بال میرے سر پر تلوار بن کر کھڑا ہو جائے تو بھی میں اس راہ سے نہ پھروں گا اور اگر میری پلکوں کا ہر بال برچھی بن کر میری آنکھوں میں گڑ جائے تو بھی کسی دوسری مہم کی طرف نہ دیکھوں گا ...... اپنے اسلاف رحمھم اللہ کی روایات کے مطابق مجھے یہاں فقر و فاقہ اور تنگی ترشی سب قبول ہے:

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند　　فرزند و عیال و خاناں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانہ تو دو جہاں راچہ کند

۱۹۳۹ء میں جب حج سے واپس آئے تو مختلف لیڈروں سے ملتے رہے اور مسلمانوں کیلئے الگ خطہ کی تجویز بنائی جس کے نتیجے میں "قرار داد پاکستان" سامنے آئی۔ مولانا نے قائداعظم محمد علی جناح کو فرمایا تھا کہ اپنا الگ خطہ لو اگرچہ ایک چارپائی کے برابر ہو۔ ہم کو سرحدوں پہ چھوڑ دینا۔ کھڑا ہونے کی جگہ ہم خود بنالیں گے۔

جہاد کشمیر ۱۹۴۸ء

پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۴۸ء کے جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیا۔ مسئلہ جہاد کشمیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مولانا غلام رسول مہر رقمطراز ہیں: "یہاں آکر انہوں نے جہاد کشمیر میں بھی حصہ لیا تھا اور "جہاد کشمیر" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ جماعتی حالات سے متعلق ان کے پاس بڑی بیش قیمت معلومات ہونگی۔ میں نے بارہا عرض کیا کہ تھوڑی سی فرصت نکال کر ان معلومات سے مشرف فرمائیں لیکن انہیں وقت نہ مل سکا۔ انہوں نے ان لوگوں کے لئے مزروعہ زمین کے دو چک بھی مخصوص کرائے تھے جنہیں جماعت مجاہدین کی خدمات کے صلے میں گوناگوں تکلیفیں پہنچی تھیں۔ ۵ مئی ۱۹۵۱ء کو وزیر آباد میں فوت ہوئے۔ وصیت کے مطابق انہیں بہ مقام بالا کوٹ اس احاطے میں دفن کیا گیا جس میں سید احمد شہید کی قبر بتائی جاتی ہے.... بہرحال مولانا صاحب مرحوم کی کسی رائے یا طریق عمل سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، وہ بڑے مخلص مجاہد اور نہایت سرگرم کارکن تھے۔

زندگی کے بیشتر اور بہترین اوقات ان مشاغل میں بسر کئے جن کے اختیار کی توفیق ملت میں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوئی اور ان بزرگوں کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو اعلیٰ دینی اور سیاسی مقاصد کے لئے جانیں ہتھیلیوں پر رکھے پھرتے تھے اور جنہوں نے راحت و آسائش کی بہاریں چھوڑ کر عمریں مصیبتوں اور پریشانیوں کے شعلہ زار میں گزار دیں، اس لئے نہیں کہ خود انہیں کوئی اونچا منصب حاصل ہو جائے، صرف اس لئے کہ اسلام کا بول بالا ہو اور اس سرزمین کے سر پر آزادی کا تاج رکھا جائے۔ وہ جہاد کو اہم اسلامی فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے اور اللہ کی رضا کے سوا ان کی کوئی غرض نہ تھی"[1]

ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم...

مولانا فضل الٰہیؒ کے عزم و ثبات کے بارے میں آباد شاہ پوری نے بڑا جاندار تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں: "۵ مئی 1951 کو یہ چراغ گل ہو گیا۔ سید بادشاہ کے قافلے کا آخری حدی خواں اپنی وصیت کے مطابق بالا کوٹ کی سرزمین میں اس مقام کے قریب دفن کر دیا گیا جہاں سید بادشاہ کا جسد شہادت کے بعد چند روز تک مدفون رہا۔ پھر دریا میں طغیانی آئی اور اس کی موجیں اس جسد بے سر کو بہا لے گئیں.... امیر المجاہدین (مولانا فضل الٰہی) کی وفات کے ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا وہ عظیم الشان باب اختتام کو پہنچ گیا جس کا "سر آغاز" شاہ ولی اللہؒ نے اپنے قلب و فکر کے نور سے لکھا تھا اور جس کی تکمیل سید بادشاہؒ اور انکے ساتھی ایک صدی سے زائد عرصے تک اپنے خون سے کرتے رہے۔ امیر المجاہدین، تحریک کے پیش رو ساتھیوں کی طرح ایک عظیم انسان تھے۔ مقصد کے ساتھ اخلاص اور لگن کا جذبہ ان کے خمیر میں گندھا ہوا تھا۔ ۵۲ سال کی مجاہدانہ زندگی میں ان پر کڑے سے کڑے وقت آئے، لیکن وہ ہمیشہ ناقابل تسخیر ثابت ہوتے۔ ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہوئے اس راہ پر گامزن رہے جو انہوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے لئے منتخب کی تھی۔ دشمن تو ان کی جان کے درپے تھا ہی کہ وہ تحریک کے دور آخر میں اس کے سب سے بڑے حریف تھے۔ انہیں اپنوں کے چرکے بھی سہنے پڑے، لیکن وہ ہر حال میں صابر و شاکر جذب و عشق میں ڈوبے، اپنے اس عہد پر کار

---

[1] سرگزشت مجاہدین صفحہ ۷۳-۵۷۲

بند رہے جو سید بادشاہ کے خلفاء کے ہاتھ پر اپنے اللہ سے کیا تھا۔ آخری زمانے میں جب جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی اور قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا' انہیں برصغیر کے دوستوں اور دوسرے اصحاب نے لکھا کہ وہ وطن واپس آجائیں' حکومت سے ان کی واپسی کی اجازت حاصل کرلی جائے گی۔ انہوں نے جواباً تحریر فرمایا: "میں ان کی ہمدردی کا تہ دل سے شکرگزار ہوں' ان سے بصد منت عرض کروں گا کہ وہ میرے اور میرے خاندان کی جملہ تکالیف کو خدائے کاشف الغم کے حوالے کر کے مجھے ہمیشہ کے واسطے ایسے بھول جائیں جیسا کوئی مردے کو قبر کے اندر دفن کرنے کے بعد بھول جاتا ہے۔ میری واپسی کے لئے کوئی ایسی راہ نہ سوچیں جو میرے لئے اور میری موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے موجب بدنامی' ضمیر کی ملامت اور اللہ اور رسولؐ کی لعنت کا سبب ٹھہرے۔ ہمارے رسولؐ اللہ نے دشمنوں کی شماتت سے پناہ مانگی ہے۔ اللہ مجھے ایسی واپسی سے پناہ دے (آمین)

ے آں لحظہ کہ روز و شب بہم پیوندند یا رشتہ مہر و مایہ برھم بنندند
ے من باتو نشینم دراں حالت نیز ارباب خرد تمام برمن خندند

وہ لمحہ جب دن اور رات آپس میں ملتے ہیں یا سورج اور اندھیرے کا رشتہ برہم کر دیتے ہیں میں اس حالت میں بادہ استعمال کرتا ہوں۔ تمام عقل مند مجھ پر ہنستے ہیں۔ یا یوں کہئے:-

ے ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(میں نے سکندر و دارا کا قصہ نہیں پڑھا' مجھ سے مہر و وفا کی داستاں کے علاوہ کچھ نہ پوچھو۔)

مولانا صوفی محمد عبداللہ صاحبؒ (محمد عمر)

۵ مئی ۱۹۵۱ء تا جولائی ۱۹۷۵ء

مولانا غلام رسول مہرؒ رقمطراز ہیں: "صوفی صاحب نے خود فرمایا کہ میں مولوی ولی محمد فتوحی والاؒ اور مولانا فضل الٰہیؒ کی دل نواز اور ایمان افروز تقریریں سن کر جماعت مجاہدین سے وابستہ ہوا۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کی وفات سے بعد کی بات ہے۔ یعنی صوفی صاحب "موجودہ صدی کے اوائل ہی میں اپنی زندگی مجاہدانہ خدمات کے لئے وقف کر چکے تھے۔ شروع میں مولانا فضل الٰہیؒ کے ساتھ چندہ فراہم کرنے کیلئے دورے کیا کرتے تھے۔ مولانا فضل الٰہیؒ قید ہو گئے تو صوفی صاحب اکیلے جماعت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ قاضی کوٹ کا مقدمہ قائم ہوا اور مولانا فضل الٰہیؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے جلال آباد و کابل ہوتے ہوئے چمرقند پہنچے تو صوفی عبداللہ صاحبؒ کا دل بھی وطن سے اچاٹ ہو گیا۔ چنانچہ وہ بھی چمرکنڈ پہنچ کر مجاہدین میں کام کرتے رہے"[1]۔

جب جنگ عظیم دوم کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تو "جماعت مجاہدین" کی یہی کوشش تھی کہ کسی طرح جرمنی ہندوستان پر حملہ آور ہو تاکہ ہندوستان کو انگریزی استعمار سے آزادی نصیب ہو۔ اس کیلئے جو جتن کئے گئے ان میں ایک "ریشمی رومال" کی تحریک بھی تھی۔ "مجاہدین یاغستان نے اپنے وفود جرمنی' روس اور ترکی بھیجے۔ حکومت جرمنی کی طرف سے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں اور نوابوں کی طرف باقاعدہ چٹھیاں بھیجی گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہندوستان پر حملہ کیا جائے تو اس جنگ کو صرف انگریز کے خلاف سمجھا جائے اور ہندوستان کے نواب اور راجے آڑے نہ آئیں۔ یہ خطوط ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے تھے۔ پہلے یہ خطوط افغانستان پہنچے پھر وہاں سے آگے پہنچائے گئے ..... انگریز کے جاسوسی نظام اور مجاہدین کی سخت نگرانی کے سبب ان خطوط کا منزل مقصود تک پہنچانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ قدم قدم پر پہرے اور جاسوس تھے۔ جس محفل میں یہ کاروائی ہو رہی تھی۔ اس میں مولانا فضل الٰہیؒ اور صوفی عبداللہ صاحبؒ بھی موجود تھے۔ جب اس ذمہ داری کو باحسن انجام دینے کی بات ہوئی تو سب خاموش ہو گئے' مولانا فضل الٰہیؒ نے صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں

۱۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۶۳۵

۔ چنانچہ سات خطوط ان کے سپرد کر دیئے گئے۔

راجہ نیپال کے پاس

" صوفی صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ میں پہلے دہلی حافظ اسحٰق صاحب کو ملا۔ وہاں کچھ چیزیں ان کے پاس رکھ کر پہلے راجہ نیپال کے پاس گیا۔ راجہ سے ملاقات کیلئے اس حلقہ کے امیر مولانا لیاقت علی صاحب کو ملا۔ وہ پری قیصر میں رہتے تھے وہاں اور بھی ہمارے آدمی تھے۔ ایک ٹھیکیدار کو مولوی لیاقت علی صاحب کی معرفت پیغام ملا کہ محمد عمر کی ملاقات راجہ سے کروانا ہے (صوفی صاحب کا اس سفر میں کوڈ نام محمد عمر تھا) ٹھیکیدار نے وقت متعین کر کے کہا تم میرے پیچھے چلے آنا۔ راستہ میں کسی چوب دار نے روکنے کی کوشش کی تو ٹھیکیدار نے روکنے نہ دیا۔ صوفی صاحبؒ نے ریشمی رومال والا خط نکال کر راجہ کے سپرد کیا۔ راجہ نے جب خط پڑھا تو انگلی دانتوں میں دبا لی۔ فوراً حکم دیا کہ شاہی مہمان خانہ کھول کر انہیں رکھو۔ ٹھیکیدار نے کہا یہ میرا مہمان ہے۔ راجہ نے جواباً کہا ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ دس ہزار روپیہ نقد اور ایک ہاتھی دیا کہ اگر کوئی کسی قسم کی تکلیف یا گرفتاری وغیرہ کا خوف ہو تو دے دلا کر نکل جانا۔ صوفی صاحب پھر مولانا لیاقت علی صاحبؒ کے پاس آئے۔ ہاتھی دو ہزار کا فروخت ہوا۔ سب پیسے مولانا لیاقت علیؒ کو جمع کروا دیئے۔ " [1]

۔۔ دوسرا خط " جودھپور " کے راجہ کو پہنچایا۔ صوفی صاحب فرماتے ہیں کہ جودھپور کا راجہ ویسے بھی مجاہدین فقیروں سے متاثر تھا۔ راجہ نے پانچ ہزار روپیہ نقد دیا اور خط کے جواب میں کہا کہ ہم ان کے آنے پر مل کر کام کریں گے۔

۔۔ جے پور کے راجہ کو نین جی کی معرفت خط پہنچایا گیا۔ مبلغ سات ہزار روپے نقد اس نے عطا کئے۔ گوالیار کے راجہ کو بھی خط پہنچایا گیا۔ اس کے بعد بمبئی جا کر ایک خط مولانا محمد علی صاحب کے ذریعے مولانا محمد علیؒ + شوکت علیؒ (علی برادران) جو جنگ آزادی کے بہترین کارکن تھے 'کو پہنچایا۔ وہ خط نواب رامپور کو پہنچانا تھا۔ ایک خط نواب بہاول پور کو دیا گیا۔ نواب نوعمر تھا۔ اس کے مشیر کار عبدالرحمٰن صاحب کی معرفت مجاہدین کو دو ہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔

۱۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۸۹۔۸۸

یہ سات خطوط صوفی محمد عبداللہ صاحبؒ نے نوابوں اور راجاؤں کو کمال دانشمندی اور رازداری کے ذریعے پہنچائے۔ ایک خط جو مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے نام تھا وہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحبؒ کو دیا۔ جو پکڑا گیا، جس وجہ سے صوفی صاحب پر دارو گیر شروع ہوئی۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم.....

مولانا فضل الٰہی صاحبؒ کی صحبتوں کا فیض تھا کہ صوفی عبداللہ صاحبؒ "جماعت مجاہدین" کے کاموں کو فراست ایمانی سے انجام دیتے تھے۔ اتنے مشکل اور کٹھن کام اللہ کی دی ہوئی ذہانت اور خلوص کے جذبوں کے سزاوار ہیں۔ "ایک مرتبہ صوفی صاحبؒ روپے لے کر گئے، چند روز پشاور میں رہے، جب قافلے کی صورت نہ بنی تو اکیلے چل دیئے۔ راستے میں ڈاکوؤں سے سابقہ پڑا۔ صوفی صاحب جھٹ پیشاب کے بہانے بیٹھ گئے اور جو رقم ان کے پاس تھی وہ بیٹھے بیٹھے زمین میں دفن کر دی، ڈاکوؤں نے تلاشی لی تو کچھ نہ پایا۔ جب ڈاکو خاصی دور چلے گئے تو صوفی صاحبؒ نے رقم نکالی اور چمرقند پہنچ گئے۔"

---- ایک مرتبہ تنہا جا رہے تھے کہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر رات کے وقت ایک بہت بڑا سانپ ملا، جسے صوفی صاحب نے اژدھا سمجھا چنانچہ "سلام علی نوح فی العالمین" کا ورد شروع کر دیا۔ اللہ نے اس بلا کو ٹال دیا۔"[1]

---- صوفی عبداللہ صاحبؒ "صاحب کرامت" بزرگ تھے۔ ان کی کرامتیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس پر ایک الگ کتابچہ مرتب ہونا چاہیئے۔ صوفی صاحبؒ نے راہ جہاد میں تن من دھن کی قربانی دی تھی۔ بیوی کو طلاق دے کے اس لئے فارغ کر دیا کہ شاید اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی ہو۔ دارورسن کی صعوبتوں میں شاید ہی ایسی صعوبت کسی دوسرے ساتھی کو دی گئی ہو جس سے صوفی عبداللہ صاحب دوچار ہوئے۔ ہم نے سنا تھا کہ انگریز نے صوفی صاحبؒ کے جسم کے نازک ترین حصوں پر ایسی ضربات لگائی تھیں کہ انہیں ناکارہ کر دیا۔ حضرت مولانا عائش محمد صاحب جو صوفی صاحبؒ کی صحبتوں کے براہ راست فیض یافتہ ہیں، ان سے اس کی تصدیق چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ "میں

1۔ سرگزشت مجاہدین صفحہ ۶۳۴

نے خود صوفی صاحبؒ سے اس بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں میرے بدن کے سب سے نازک حصوں پر ضربیں ماری جاتی تھیں کہ مجاہدین کے راز بتا دوں خصوصا ریشمی رومال والے خطوط ' لیکن میں نے کبھی راز نہ دیا ۔ مولانا عائش محمد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ آپ اتنی سخت تکلیف کیسے برداشت کرتے تھے تو آپ نے فرمایا " میں " الحمد شریف " پڑھتا رہتا تھا تو مجھے اس درد کا کچھ احساس نہ ہوتا تھا ۔ " ذرا اندازہ لگایئے کہ کس طرح صوفی صاحبؒ عزم و ہمت کا ہمالہ ثابت ہوئے ۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

مدرسہ اوڈانوالہ کا قیام

رجب ۱۳۵۷ھ (ستمبر ۱۹۳۸ء)

صوفی عبداللہ صاحبؒ اکثر و بیشتر چمرقند میں ہی رہتے تھے ۔ سال میں ایک دو دفعہ آتے اور چندہ اکٹھا کر کے لے جاتے ۔ آپ کا حلقہ عقیدت سندھ سے لے کر صوبہ بہار تک پھیلا ہوا تھا ۔ ۱۹۳۸ء کے قریب صوفی صاحبؒ کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہوئی ۔ صوفی صاحبؒ نے مدرسہ اوڈانوالہ کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے پھر سرحد پر نہ جا سکے ۔

مولانا فضل الٰہیؒ سے مشورہ کر کے طے کیا کہ مدرسہ کیلئے جگہ وہ منتخب کی جائے جو وسائل رسل و رسائل سے کافی دور ہو اور کوئی اہم آبادی قریب نہ ہو ۔ وہاں سے مجاہدین بھی بنا کر بھیجنے چاہئیں اور چندہ بھی بھیجا جائے ۔ اس طرح مدرسہ کیلئے حسین خاں والا المعروف " اوڈانوالہ " جو کہ ماموں کانجن ریلوے سٹیشن سے قریباً چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہے ' مدرسہ بنایا گیا ۔ " صوفی صاحب کو اللہ نے عمل کا پیکر بنایا تھا ۔ چمرکنڈ سے واپس آئے تو دیکھا کہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں اہل حدیث کی کوئی درس گاہ نہیں چنانچہ انہوں نے ۱۳۵۷ھ (ستمبر ۱۹۳۸ء) کو اللہ کا نام لے کر ایک درسگاہ کی بنیاد رکھ دی ۔ آج یہ ایک کامیاب درسگاہ ہے ۔ جس میں پنجاب کے علاوہ بنگال ' مدراس ' یو پی '

سندھ ، بلوچستان اور سرحد کے طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں "[1]

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن

آجکل " مدرسہ اوڈانوالہ " جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے نام سے موسوم ہے ۔ جو ماموں کانجن ریلوے سٹیشن کے ساتھ واقع ہے ۔ سینکڑوں تشنگان قرآن و سنت دلوں کی پیاس بجھاتے ہیں اور پھر ملک کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں قال اللہ و قال الرسول ؐ کے دلنواز ترانے بلند کرتے ہیں ۔ " اوڈانوالہ " میں بھی مدرسہ اپنی جگہ کام کر رہا ہے ۔ اب ماموں کانجن میں جامعہ تعلیم الاسلام کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے ، تعمیر الحمدللہ تیزی سے جاری ہے ۔ مولانا فضل الٰہی صاحب ؒ کی وفات کے بعد جماعت مجاہدین کی امارت صوفی عبداللہ صاحب ؒ کے حصے میں آئی اور وہ ۵ مئی ۱۹۵۱ء سے لے کر تاحین حیات جولائی ۱۹۷۵ء تک اس خدمت پر مامور اور سرشار رہے ۔

امارت مولانا محمد سلیمان ؒ

اپریل ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۸۳ء

مولانا محمد سلیمان ؒ جماعت مجاہدین کی امارت کے ساتھ ساتھ جماعت کی دانشگاہ " جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن " (فیصل آباد) کا اہتمام و انصرام فرماتے رہے ۔ جامعہ ابی بکر الاسلامیہ ، کراچی ، جیسی عظیم بین الاقوامی یونیورسٹی انہی کے مبارک دور کی یادگار ہے ۔ علاوہ ازیں ڈیرہ غازی خاں ، خانپور ، ستیانہ بنگلہ و دیگر متعدد مقامات پر دینی اداروں اور طالبات کے مدارس کا آغاز بھی انہی کے دور میں ہوا ۔ جہاد کشمیر ۱۹۴۸ء میں مولانا محمد سلیمان صاحب ؒ نے بھرپور حصہ لیا

جہاد میں حصہ

مولانا محمد سلیمان ؒ کشمیر کے مشکل ترین محاذ " پونچھ " پر دشمن سے برسرپیکار ہے ۔ بقول حضرت مولانا عائش محمد صاحب سردار عبدالقیوم صاحب نے فرمایا کہ ہم جنگ تو کر ہی رہے تھے مگر ہمیں جہاد کا صحیح شعور مولانا فضل الٰہی ؒ نے دیا ۔ انھوں نے اپنی پیرانہ

---

[1] سرگزشت مجاہدین صفحہ ۶۳۶

سالی کے باوجود جہاد میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم نے عرض کیا آپ کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تو حضرت مولانا فضل الٰہی صاحب ؒ نے فرمایا " میرے اکلوتے بیٹے محمد سلیمان کو جہاد کشمیر پر لے جایئے اور جہاد کے مشکل ترین محاذ پر اسے متعین کیجئے۔ " اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمد سلیمان صاحب اپنے والد مرحوم کی تمناؤں پر پورا اترے۔

جہاد افغانستان میں بھی مولانا سلیمان ؒ نے جانی اور مالی تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ وہ نام و نمود کے قائل نہ تھے لیکن ان کی امارت میں " جماعت مجاہدین عموماً اور غازی عبدالکریم صاحب ' جناب پروفیسر چوہدری محمد ظفر اللہ صاحب ' جناب ڈاکٹر محمد ارشد صاحب رندھاوا مولانا خالد گرجاکھی صاحب اور مولانا حکیم محمود صاحب خصوصا دامے ' درمے ' قدمے ' سخنے جہاد افغانستان میں شریک رہے اور اب تک یہ مشن بفضل الٰہی جاری و ساری ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بیماری اور نقاہت کے سبب عملی طور پر جہاد میں شرکت سے معذور ہو گئے تو حسرت کے ساتھ شوق جہاد میں زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا:۔

؎ آتی ہے صدائے جرس ناقہ لیلیٰ　　　صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر ایک دوست نے انٹرویو حاصل کرنے کی تمنا کی تو بد بتہ اپنے پاس پڑی ہوئی چند کلیاں انہیں عنایت فرمائیں اور ارشاد فرمایا ـــ ان سے خوشبو آ رہی ہے! جب اس نے اثبات میں سرہلایا تو آپ نے فرمایا ـــ "اگر میری کوئی خوشبو ہوئی تو آپ تک خود بخود پہنچ جائے گی"

اطاعت امیر

غالباً ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا عارف باللہ مولانا عبداللہ صاحب ؒ نے سالانہ کانفرنس ماموں کانجن ؛ میں مولانا محمد سلیمان ؒ صاحب سے کسی پیشگی مشورے کے بغیر ان کی جانشینی کا اعلان فرمایا تو نہایت ادب سے عام اجلاس میں اعلان فرمایا:

ع　سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

میں ایک کاروباری آدمی ہوں ' اللہ تعالیٰ مجھے اس ادارے کو چلانے کی توفیق عطا فرمائے "

استقامت

ادارہ امور بحالیات سندھ کے ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے حاضر ہو کر عرض کی حضرت آپ کے والد گرامی امیر المجاہدین جناب مولانا فضل الٰہیؒ کی پاکستان بنانے میں بہت گراں قدر خدمات ہیں ' آپ کراچی میں کسی متروکہ جائیداد کی طرف اشارہ فرمائیں تو آپ کی خدمت میں بصد ادب پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ اس پر حضرت مولانا محمد سلیمانؒ نے فرمایا : " والد مرحوم کی خدمات بوجہ اللہ تھیں ان کا دنیا میں کوئی صلہ وصول نہیں کرنا چاہتا۔ "

اپنے اہم جماعتی منصب امارت اور دینی جامعات کی عظیم ملی امانت کی باحسن وجوہ ادائیگی کیلئے ۲۷ ذوالحجہ ۱۴۰۱ بمطابق (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء) مفصل وصیت نامہ تحریر فرما کر اپنے فرزند ارجمند عزیز القدر جناب زاہد الرحمٰن صاحب کے پاس محفوظ فرما دیا۔ ان کے خلف الرشید ' نیک نام اور صاحب بصیرت بیٹے نے اس امانت کو نہ صرف اپنے پاس محفوظ رکھا بلکہ اپنے عظیم والد بزرگوار کی وفات حسرت آیات کے بعد یہ وصیت نامہ جماعت مجاہدین کی شوریٰ میں پیش کر دیا اور شہادت عدل زبانی طور پر بھی دی ۔ جماعت کی شوریٰ نے اپنے امیر کی وصیت پر عین کتاب و سنت کے مطابق من و عن عمل کرتے ہوئے حضرت غازی عبدالکریم خاں صاحب متعنا اللہ بطول حیاتہ کے مبارک ہاتھ پر عین کتاب و سنت کے مطابق سمع و اطاعت کی بیعت کا شرف بھی حاصل کیا اور تمام جماعتی اداروں کی سربراہی کی اہم ذمہ داری بھی انہی کے سپرد کی ۔ حضرت مولانا محمد سلیمانؒ کی یہ وصیت عربی کے اس شعر کے مصداق تھی ۔

اھیم بلیلی ماحییت وان امت ۔ واو کل بھا من یھیم بعدی

(جب تک دم میں دم باقی ہے مجھے لیلیٰ (جماعت مجاہدین) کا ہی خیال رہتا ہے اگر مجھے دنیا سے رخت سفر باندھنا پڑا تو میں اس کی باگ ڈور ایسے آدمی کے سپرد کروں گا ' جو میرے بعد اس کا خیال رکھے گا۔)

اس لحاظ سے ان کی نگاہ انتخاب حضرت غازی عبدالکریم خاں صاحب حفظہ اللہ پر

پڑی' انہیں اس کی ذمہ داری سونپ کر وہ فروری ۱۹۸۳ء اپنے اللہ کے ہاں سدھارے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت غازی عبدالکریم خاں صاحب مدظلہ العالی (باجوڑ ایجنسی)

غازی عبدالکریم صاحب نے تقریباً ۱۹۲۸ء میں مولانا فضل الٰہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ ان کا گاؤں کوہاٹی (باجوڑ ایجنسی) چمرقند سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں مولوی عبدالخالق صاحب کی شاگردی میں دینی علوم کا ادراک حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک جو جنگیں ہوئیں ان میں شریک رہے۔ صوفی عبداللہ صاحبؒ کی طرح مولانا فضل الٰہیؒ کے دست راست تھے۔ بلکہ جب صوفی عبداللہ صاحبؒ مدرسہ کی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ عرصہ سرحد نہ جا سکے تو ان کی کمی غازی عبدالکریم صاحب پوری کرتے رہے۔ "لکنڈی کھرپہ" کی جنگ تین ماہ جاری رہی۔ پانی کی انتہائی قلت تھی۔ زخمی ساتھیوں کیلئے مٹہ سے دوائی لینے گئے۔ ایک ہوائی جہاز نے انہیں دیکھ لیا' سارا دن ان پر بمباری کرتا رہا۔ دوسری جنگ خیبر کے آفریدیوں سے ہوئی۔ اس کو "کھجور" کی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں بھی غازی صاحب تین ماہ برسرپیکار رہے۔ "ناکی کنڈھاب" کی جنگ میں ایک دن میں انگریز کی تین ہزار فوج برباد ہوئی۔ غازی صاحب اس میں بھی شریک رہے۔ غازی صاحب خود بیان کرتے ہیں "کھرپہ" پر ایک شبخون مارا۔ انگریز کے چالیس آدمی واصل جہنم ہوئے۔ ہمارے دو مجاہد شہید ہوئے' تین لاپتہ اور تین زخمی ہوئے۔ فرماتے ہیں "میری زندگی کی یہ سب سے سخت ترین جنگ تھی"۔ "جنگ پانچ کنڈداس" میں بھی انگریز کے تین ہزار آدمی مارے گئے' دو افسروں کے سر کاٹ کرلائے گئے' مولانا فضل الٰہیؒ بھی ان جنگوں میں شریک تھے اور میں ان کے ہمراہ تھا۔"[۱]

پائے ثبات

غازی صاحب اپنے اسلاف کے سچے پیرو ہیں۔ کبھی جو کڑا وقت آیا تو ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ بارہا جنگل کے جانوروں حتیٰ کہ ایک دفعہ تو "جنگل کے بادشاہ" (شیر) کا بھی سامنا ہوا۔ لیکن غازی صاحب نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کبھی مونہہ

۱۔ تحریک مجاہدین کا آخری دور (ملخصاً صفحہ ۲۰۶)

نہ موڑا۔ "پری" کی جنگ میں دریائے سوات کے کنارے "ملک مٹرز" کے علاقہ سے شبخون کے بعد واپسی پر انگریز سپاہیوں کے گولہ سے آپ تنہا زخمی ہوئے۔ فرماتے ہیں "دن چڑھے مجھے فقیر علی نگار کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ میری خدمت پر دو آدمی مامور ہوئے۔ پندرہ روز وہاں قیام رہا۔ پھر میرے علاقہ باجوڑ کے آدمی پہنچ گئے وہ فقیر علی نگار صاحب سے اجازت لے کر مجھے اپنے گھر لے آئے۔ قریباً دو ماہ بعد مولانا فضل الٰہیؒ خود کوہاٹی میری بیمار پرسی کرنے آئے۔ اس وقت تک میرا زخم کچھ اچھا ہو گیا تھا لیکن تھوڑا بہت چلنے سے میری ٹانگ پھر سوج گئی' کیونکہ لوہے کے ٹکڑے ابھی زخم کے اندر تھے۔ ایک چوپایوں کے جراح گل آزاد کو بلایا گیا۔ اس کے پاس کوئی نشتر نہ تھا حجام سے استرا منگایا جس کا مونہہ بلامبالغہ رنبہ کے برابر موٹا تھا کیونکہ وہ جلد کو بالکل نہیں کاٹتا تھا۔ جراح نے پورا زور لگا کر انگوٹھے سے دبا کر جلد کاٹی۔ استرا لوہے کے ٹکڑے سے جا کر لگا۔ بم کے ٹکڑے نکالنے چاہے تو وہ ہاتھ میں نہ آتے تھے آخر لوہار سے زنبور منگوا کر اس سے کھینچ نکالے گئے۔ قریباً دو ماہ اور صاحب فراش رہا۔ تین چار ماہ بعد حضرت مولانا (فضل الٰہیؒ) کی خدمت میں چمرکند پہنچ گیا۔" [1]

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا دامن یزداں چاک یا اپنا گریباں چاک

دوسرا واقعہ بے حد ہوشربا ہے۔ سوائے قوت ایمانی اور فراست مومن ایسا خیال نہیں آ سکتا۔

"فقیرا ایپی کی جب وزیرستان میں انگریزوں سے ٹھن گئی تو اس نے مولانا فضل الٰہی صاحبؒ کو خط لکھا کہ آپ بھی فوراً یہاں پہنچ جائیں اگر ہم ناکام ہوئے تو اس کا وبال آپ پر ہو گا۔ اس جہاد کی تیاری کیلئے حضرت صاحب نے مجھے ہندوستان کی طرف بھیجا تاکہ ان سے مشورہ اور امداد حاصل کروں۔ میں راولپنڈی' حافظ فضل کریم صاحب' عثمان والا میں سردار محمد شفیع کے پاس' شیخ عبدالرحمٰن امرتسری کے پاس اور آخرکار صوفی عبداللہ صاحب کے پاس اوڈانوالہ میں تین ماہ رہا۔ صوفی صاحب مجھے لے کر زین العابدین پہنچے۔ واپسی پر حافظ عبدالکریم صاحب سے سونے کے میڈل جو کہ مولانا (فضل الٰہیؒ صاحب) کو

۱۔ ایضاً صفحہ ۲۱۰-۲۱۱

حکومت افغانستان نے دیئے تھے' وہ بھی پہنچا دیئے ۔ شب قدر کے قریب واپس جا رہا تھا تو میری مخبری ہو گئی ۔ اس وقت میرے پاس قریباً پانچ ہزار روپے نقد' دو تمغے اور پانچ چھ سو کا مال تھا ۔ سامان وغیرہ میں نے ایک نمک فروش کی دوکان میں ایک کاررواں والوں کی سپرد داری میں دے دیا ۔ تمغے اور نقدی میرے پاس تھی ۔ شام کو سی ۔ آئی ۔ ڈی کے ایک آدمی نے مجھے بلایا اور کہا سچ سچ بولو کہ روپیہ کس لئے لائے ہو ؟ اگر سچ سچ بتا دیا تو تمہیں خوش کر دیں گے ورنہ تمہیں سات سال قید ہو جائے گی ۔ میں نے بتا دیا کہ میں آیا حضرت صاحب" (مولانا فضل الٰہی صاحب") کے پاس سے ہوں ۔ مال خرید کرنا تھا ۔ مگر مال مہنگا ہے اس لئے واپس لے جا رہا ہوں ۔ انہوں نے پوچھا تمغے کس لئے لائے ہو ؟ میں نے کہا یہ راز ہے ۔ میں نہیں بتا سکتا ۔ اس کے بعد چار روز تک خوب پٹائی ہوئی ۔ مخبری کرنے والا واقف کار تھا ۔ اس نے کہا اگر مدد کی ضرورت ہو تو بتانا ؟ میں نے اسے یہ بھی نہیں جتلایا کہ

ع اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تست

آخر ایک بات مجھے سمجھ میں آئی' میں نے اس سے کہا قسم اٹھاؤ تو تم سے دل کی بات کہہ دیتا ہوں ۔ جب اس نے قسم اٹھائی تو میں نے انہیں بتایا کہ دراصل میں نے حضرت صاحب سے چوری کئے ہیں ۔ چونکہ کسی پر اعتبار نہیں اس لئے اپنے پاس ہی رکھتا ہوں ۔ اس نے جب اپنے افسر کو بتایا وہ بہت خوش ہوا ۔ اس کے بعد داروگیر کا سلسلہ بند ہو گیا' میری بڑی عزت اور تکریم ہونے لگی ۔ مجھے یہ ترغیب دی گئی کہ اگر ایک کام کر دو گے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا ۔ میں نے کہا اگر میرے بس کا روگ ہوا تو ضرور کروں گا ۔ انہوں نے کہا مولانا (فضل الٰہی صاحب") کے ساتھ دو آدمی ہیں ان کا پتہ بتاؤ کون ہیں ؟ کہاں رہتے ہیں ؟ نیز ہمیں ان کی خط و کتابت لا دیا کرو' میں نے عرض کی مخبری ہماری قوم میں بڑا عیب ہے' جس کی پاداش میں ہمارا گھر جلا دیا جائے گا اور مویشی ذبح کر دیئے جائیں گے ۔ آخر سات روز کی ردوکد کے بعد میں مان گیا' اس شرط پر کہ میرا راز باہر نہیں نکلے گا ۔ انہوں نے کہا تمہیں یہاں بھی آنا نہیں پڑے گا' ہمارا آدمی وہاں جایا کرے گا آپ کو تنخواہ بھی پہنچائے گا اور خطوط وغیرہ بھی لے لیا کرے گا ۔ انہوں نے مجھے کپڑوں کا جوڑا'

پچاس روپے نقد پیشگی ایک ماہ کی تنخواہ دی اور سارا مال بھی واپس کر دیا اور کارواں والوں کو کرایہ بھی دے دیا۔ حضرت صاحب کو کارواں والوں سے میری گرفتاری کا حال معلوم ہو چکا تھا وہ اس دن سے روتے ہی رہتے تھے کہ اب شاید کتنے خاندانوں کی شامت آئے گی۔

جب میں دوسرے روز چمرقند پہنچا اور بچوں نے یہ خبر مجھ سے پہلے حضرت صاحب کو یوں سنائی کہ "لالی آگیا" ہے حضرت صاحب بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہی رو بھی رہے تھے۔ پہلی بات یہ پوچھی کہ کتنے گھروں کو جلا آئے ہو؟

میں نے عرض کیا حضرت! گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کسی کو نہیں جلایا۔ "جب میں نے سارا واقعہ سنایا تو حضرت صاحب" نے اٹھ کر میری پیشانی چوم لی اور میرے حق میں بہت دعائیں کیں، میں آج تک ان کی دعاؤں کا اثر دیکھ رہا ہوں کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں آئی۔"[1]

؎ نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

جہاد کشمیر میں حصہ

اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتہ اور کلکتہ کے فوراً بعد بنگال کے مختلف اضلاع بردوان، بیربھوم وغیرہ میں مسلم کشی اور آسام میں مسلم آزاری کے زہرہ گداز واقعات شروع ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ مولانا فضل الٰہیؒ لکھتے ہیں:۔

" راقم الحروف نے اس آگ کو بجھانے کیلئے حکومت ہند پر سرحدی دباؤ ڈالنے کی تجویز سوچی اور عبدالکریم خاں جو سرحد آزاد علاقہ باجوڑ کا رہنے والا ہے اور بچپن سے میرا رفیق ہے اور میرے تعلق کی وجہ سے تمام قبائل آزاد کے اندر کوہ سیاہ سے لے کر وزیرستان تک اور افغانستان کے اندر کافی اعتبار رکھتا ہے اور مرکز چمرقند کا ذمہ وار رکن بھی ہے، اسے میں نے آزاد سرحدوں پر تبلیغ کیلئے مقرر کیا ہے تاکہ جگہ جگہ سے اس ظلم عظیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروائے اور حکومت ہند پر زور ڈلوائے کہ وہ اس ظلم کا دروازہ بند کرے، نیز اسے یہ ہدایت کی کہ آزاد قبائل کے دورے سے جلد نکل کر علاقہ کڑال میں پہنچے اور اس قوم کو میری طرف سے یہ پیغام دے کہ وہ اپنے وطن کے

---

[1] تحریک مجاہدین کا آخری دور صفحہ ۱۵۔۲۱۴

ہندوؤں اور سکھوں کا ایک معتبر وفد گاندھی' نہرو اور پٹیل وغیرھم کے پاس بھجوائے کہ وہ ان سے درخواست کریں کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے ہندوؤں اور سکھوں کو اس مسلم کشی اور مسلم آزاری کی پالیسی سے روکیں۔ یہ تحریک بند نہ ہوئی تو اس کا رد عمل ضرور صوبہ سرحد' پنجاب' بلوچستان اور سندھ وغیرہ میں شروع ہو جائے گا اور کیا عجب کہ جن جن صوبوں کے اندر مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ہندو کشی بھی شروع ہو جائے اور پھر معاملات قابو سے باہر ہو جائیں۔ کڑال قوم نے میری اس بات کو دل کے کانوں سے سنا اور فوراً اس پر عمل کیا۔"

یہ دورہ تو غازی عبدالکریم خان صاحب کا سرحد کے ریفرنڈم کے سلسلے میں تھا' مگر اب جہاد کشمیر کا پھر آغاز ہو چکا تھا۔ اس میں جماعت مجاہدین کیسے شامل ہوئی۔ یہ کہانی بھی مولانا فضل الہیٰ کی زبانی ہی سنتے ہیں :۔ لکھتے ہیں :۔ "صوبہ سرحد میں عبدالکریم خاں کا دورہ بھی بہت کامیاب رہا۔ اس کی مادری زبان پشتو ہے۔ سرحد آزاد علاقہ باجوڑ کا رہنے والا ہے۔ برطانوی محاربات میں وہ ہر جگہ شریک جہاد رہا۔ ٹوٹی اور آگرہ کی جنگ میں ۱۹۳۴ء کے جہاد میں وہ توپ کے گولے سے زخمی بھی ہوا۔ صوبہ سرحد کے مقامی راہنماؤں سے مل کر ریفرنڈم کی مہم کے کامیاب بنانے میں اس نے اور ملک گل ضمیر خاں اور محمود خیل چمرقندی نے نمایاں حصہ لیا۔ راقم الحروف تو وزیرستان میں تحریک پٹھانستان (پختونستان) کے انسداد میں مشغول رہا' مگر عبدالکریم خاں مذکور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے تبلیغی فرائض سے فارغ ہو کر کڑال کے علاقہ میں چلا گیا۔ تاکہ وہاں مولانا محمد سنھوالوی اور عبدالقادر خاں وغیرہ مقامی مبلغین اسلام سے مل کر قوم مذکور کو آنے والے خطرات کے مقابلے کیلئے تیار کرے۔ یہ لوگ جہاد فی سبیل اللہ کی ان ہی تیاریوں میں مشغول تھے کہ ناگہاں ڈھونڈ قوم کی طرف سے پیغام پہنچا۔"۔۔۔۔۔"جہاد کا ڈنکا بج چکا ہے' آؤ اور ڈوگرہ' راج کا خاتمہ کرو' کشمیر پونچھ' جموں کو دوبارہ دارالاسلام بناؤ۔ بہار کے مسلمانوں کا بدلہ لینا ہے تو سب کام چھوڑ کر یہاں پہنچو"

اس پیغام کا کڑال میں پہنچنا اور عبدالکریم خاں کا اپنے رفقا کار کے ہمراہ سیدھا پونچھ پہنچنا ایک ساتھ ہوا۔ چونکہ اس جہاد کا بانی اور اس کے رفقاء سب پشت در پشت حضرت

سید احمد شہیدؒ کی مقدس انقلابی تحریک کے خیر خواہ تھے اور اس کے معاون و مددگار چلے آ رہے تھے' اس لئے انہوں نے عبدالکریم خاں کے اس ناگہانی ورود کو ان ابتدائی ایام کے اندر نہایت ہی نیک فال سمجھا۔ اس غیبی امداد سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور ان کو یقین ہو گیا' اب ہماری فتح میں زیادہ دیر نہیں تاوقتیکہ راقم الحروف فقیرا تمی سے نپٹ کر بذات خود وزیرستان سے محاذ پونچھ پر پہنچا۔ عبدالکریم خاں برابر مجھے تمام حالات جنگ سے خصوصی قاصدوں کے ذریعے اطلاع دیتا رہا اور اس دوران دو مرتبہ خود بھی میرے پاس پہنچا۔ اس کے چند روز بعد عبدالغنی خاں فاتح مہم ریفرنڈم آسام بھی سلہٹ سے راہ کے خطرات سے دوچار ہوتا ہوا سیدھا محاذ پونچھ پر پہنچ گیا۔ اس طرح دوسرے اراکین چمرقند بھی خبر پاتے ہی تمام اطراف سے سمٹ سمٹا کر جہاد کشمیر میں شریک ہو گئے۔ کشمیر کے محاذوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور مشکل محاذ پونچھ کا ہے۔

مشکلات و مصائب

وہاں تک پہنچنے کیلئے کوہالہ سے چالیس میل روزانہ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ سڑک نہ ہونے کی وجہ سے رسد رسانی کا کام بہت محنت طلب ہے۔ اس لئے اکثر فقر و فاقہ کی نوبت بھی پہنچتی رہتی ہے۔ سردار عبدالقیوم خاں کو مختلف مورچوں کی دیکھ بھال کیلئے بہت مرتبہ چالیس چالیس میل پا پیادہ پہاڑی راستے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اہل وطن کے اندر سے کوئی جوان اس دوڑ دھوپ کے اندر چند روز سے زیادہ نہ نبھ سکا۔ البتہ مرکز چمرقند کے دو نوجوان عبدالکریم خاں سرحدی اور عبدالغنی خاں قصوری اس معیار میں اس وقت تک پورے اترتے رہے ہیں۔

نماز عشق.....

ان سختیوں کے ساتھ ساتھ جماعت مجاہدین کے ان سرفروشوں کا ذوق عبادت اور شوق شہادت بھی دیدنی تھا۔ بقول اقبالؒ

؎ آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز　　قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

مولانا فضل الٰہیؒ لکھتے ہیں :۔ "سردار عبدالقیوم کے ابتدائی ساتھیوں میں ایک کا نام

مولوی محمد بخش ہے جو دینی علوم کا فاضل ہونے کے علاوہ شیریں مقال اور میدان جنگ کا ویسا ہی امام ہے جیسے نمازوں کا، مشین گن کی برستی گولیوں کے نیچے نماز پڑھنا اس کی دلیری ہے"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔ " سردار عبدالقیوم خاں اور اس کے ان دو ساتھیوں (غازی عبدالکریم خاں + غازی عبدالغنی خاں) کا وہ منظر قابل دید ہوتا ہے جبکہ وہ برستی گولیوں اور ہوائی جہازوں کی بمباری کے اندر فریضہ نماز ادا کرتے ہیں۔"

۔ یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے ۔ جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ۔ سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو ۔ عجب چیز ہے لذت آشنائی

کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، کبھی خالدؓ و طارقؒ کے روپ میں کبھی صلاح الدین ایوبیؒ اور محمد بن قاسمؒ کے روپ میں اور کبھی سردار عبدالقیوم، غازی عبدالکریم اور غازی عبدالغنی کی صورت میں۔ کبھی " تاریخ کا مسافر دریائے کنہار کے مغربی کنارے سرنگوں بیٹھا ہے" تو کبھی چمرقند کی سنگلاخ وادیوں میں سیدین شہیدین کے نقش پا تلاش کرتا ہے، کبھی تاریخ کا یہ مسافر مرکز ستھانہ کی تاریک راہوں میں اجالوں کے نشان ڈھونڈتا ہے اور کبھی بالا کوٹ کے پہاڑوں اور سبزہ زاروں میں پھیلی ہوئی شہادت کی خوشبو کی لپیٹ میں سرمست وادی کشمیر میں جا اترتا ہے، تاریخ کا مسافر جب پونچھ کی اس وادی میں گامزن ہوتا ہے تو اسلاف کے ان متبعین کے کارناموں تک آ کر رک جاتا ہے، اس کا قلم حرکت میں آتا ہے، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، وہ لکھتا ہے:

" یہ چند وہ سعید روحیں ہیں جنہوں نے پونچھ میں جہاد کشمیر کی بنیاد ڈالی اور بدوں کسی امید، کسی خارجہ امداد کے ڈوگرہ راج کے برخلاف سب سے پہلے ہتھیار اٹھائے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے اس پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جسے ان کے اسلاف حضرت سید احمد بریلویؒ کی سرپرستی میں انیسویں صدی میں ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تھے"

ان سعید روحوں کے ناموں کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہاں مگر مرکز چمرقند کے جن

جانثاروں نے اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مولانا فضل الٰہیؒ نے ان کے نام دیئے ہیں ۔ لکھتے ہیں:

" مرکز چمرقند کے اراکین میں سے عبدالکریم خاں (جو اس وقت جماعت مجاہدین پاکستان کے امیر ہیں) اور عبدالغنی خاں کے علاوہ مشہور مبلغ اسلام حافظ محمد یوسف خاں اور راقم الحروف کا اکلوتا بیٹا محمد سلیماں خاں، اور غزنوی خاندان کا لب لباب عمر فاروق خان اور بشیر احمد خاں از خاندان عالیہ پاکپتن بھی ہیں ۔ ان میں سے ہر فرد ہزار نوجوانوں کا ایک نوجوان ہے ۔ یہ جانباز ایک ہی وقت میں تبلیغ اسلام کا فریضہ اور قتال فی سبیل اللہ کی مہم خدمات بجا لا رہے ہیں ۔ علامہ فہامہ مولانا ابو نعیم عبدالحکیم خاں ندوی مولوی فاضل پنجاب یونیورسٹی برادر کلاں عبدالغنی خاں مذکور برما، سیام اور حدود چین میں مدت مدید سے مرکز چمرقند کی طرف سے اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کی تبلیغ میں مشغول ہیں ۔ الیکشن کے زمانے میں مرکز کی طرف سے خضر حیات اور کانگرس کی تحریکات کی بیخ کنی میں بھی انہوں نے بہت حصہ لیا ہے ۔ چونکہ کڑال اور ڈھونڈ قومیں حضرت سید احمد شہیدؒ کی مقدس تحریک کے انیسویں صدی سے بمنزلہ دو ہاتھ اور دو پیر اور دو آنکھ چلی آ رہی ہیں اس لئے انہیں باہمی شناخت اور اعتماد حاصل کرنے میں کچھ دقت نہ ہوئی ۔ اس حسن تدبیر سے مرکز چمرقند نے بھی اس تحریک کے سابقین اولین کے زمرہ میں شمار کئے جانے کا عنداللہ و عندالناس استحقاق پیدا کر لیا ۔ اس کے بعد راقم الحروف بھی بذات خود پٹھانستان (پختونستان) تحریک پر بغیر امداد پاکستان کے فوق العادۃ فتح حاصل کر کے مظفر و منصور پونچھ کی تحریک میں شامل ہو گیا اور چمرقند سے اپنا سارا اسلحہ اور ذخیرہ کارتوس منگوا کر اس مقدس جہاد کے کامیاب بنانے میں وقف کر دیا اور اپنی عادت قدیم کے مطابق مال و جان سے بہت قیمتی خدمات خفیہ طور پر انجام دیتا رہا ۔ یہاں تک کہ حیدر آباد دکن کے وفد سے کراچی میں مل کر جب واپسی میں ۲۶ جولائی ۱۹۴۸ء (۱۸ ۔ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ) بروز سوموار پونچھ کے محاذ جنگ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں وزیر آباد اپنے آبائی گھر داخل ہوا کہ اطمینان کے ساتھ دو ماہ کی جمع ڈاک کا جواب لکھ سکوں، ناگاہ پولیس پہنچی اور راقم الحروف کو برطانوی عہد کے ایک ۲۷ سالہ گذشتہ مقدمہ کے ذیل میں گرفتار

کر لیا۔"

لالی سے امیر "جماعت مجاہدین" تک

یہ بات بہت سے احباب سے مخفی ہے کہ عبدالکریم نام کے تین مجاہد جماعت مجاہدین میں داد شجاعت دیتے رہے ہیں۔ ان میں ایک مجاہد "عبدالکریم چمرقندی" کے نام سے معروف ہیں۔ دوسرے یاغستان میں ہی راہی ملک عدم ہو گئے تھے۔ احباب غازی عبدالکریم چمرقندی کو ہی غازی عبدالکریم خان سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کی الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ عمر کا بڑا تفاوت ہے۔ عبدالکریم چمرقندی اب بھی بقید حیات ہیں۔ زبیر احمد زاہد صاحب راوی ہیں کہ جب ان کی صبغت اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ جماعت مجاہدین کا کام الحمد للہ جاری ہے۔ نظام امارت کی کوئی کڑی تاحال نہیں ٹوٹی تو انہوں نے پوچھا آجکل امیر کون ہیں؟ انہیں بتایا گیا (غازی) عبدالکریم خاں (باجوڑ ایجنسی) تو ان کے مونہہ سے بے ساختہ نکلا "اچھا وہ لونڈا (لالی) جماعت مجاہدین کا امیر ہو گیا"۔ اس سے احباب کو علم ہو گا عبدالکریم چمرقندی صاحب الگ شخصیت ہیں اور غازی عبدالکریم خاں عرف "لالی"[1] الگ شخصیت ہیں۔ غازی عبدالکریم خاں پٹھان ہیں، باجوڑ ایجنسی میں ان کا گاؤں "کوہاٹی" اب بھی موجود ہے۔ لیکن خود غازی عبدالکریم صاحب آجکل لودھراں ضلع ملتان کے قریب "مجاہد آباد" میں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا فضل الٰہی صاحب ؒ کی کوششوں سے جو زمین مجاہدین کو ملی تھی، وہاں ان کا بیٹا کاشتکاری کرتا ہے۔ غازی عبدالکریم صاحب اپنی اس پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی مسلسل اور پیہم عملی جہاد میں شریک ہیں۔ افغانستان کے مجاہدین کی امداد میں بنفس نفیس قندھار سیکٹر پر اور کبھی کابل و جلال آباد محاذ پر داد شجاعت دیتے رہتے ہیں۔ انہیں مولانا سلیمان وزیر آبادی صاحب ؒ نے اپنی وصیت کے ذریعے جو ان کی ڈائری میں لکھی ہوئی ہے "جماعت مجاہدین کا امیر نامزد کیا تھا۔ مولانا سلیمان صاحب ؒ وزیر آبادی کی رحلت کے بعد احباب جماعت نے انہیں اپنا امیر تسلیم کیا ہے۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے وہ اپنے منصب سے خوش اسلوبی سے عہدہ برا ہو رہے ہیں۔ اللہ انہیں اس کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

۱۔ "لالی" غازی عبدالکریم صاحب کا بچپن کا نام ہے۔

---- ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد ----

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم

ماخذ

۱۔ "سیرت سید احمد شہید" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲۔ "جب ایمان کی بہار آئی" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۳۔ "سرگزشت مجاہدین" مولانا غلام رسول مہرؔ

۴۔ "جماعت مجاہدین" مولانا غلام رسول مہرؔ

۵۔ "سید بادشاہ کا قافلہ" آباد شاہ پوری

۶۔ "حیات طیبہ" مرزا حیرت دہلوی

۷۔ "کالا پانی" مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ

۸۔ "تحریک مجاہدین کا آخری دور" مولانا خالد گرجاکھی

۹۔ "اتحاف النبلاء باحیاء ماثر الفقہاء المحدثین"

۱۰۔ "ہندوستان مسلمان" (انگلش) ولیم ہنٹر

۱۱۔ "وہابی ہندوستان میں"

۱۲۔ "وزیر الدولہ کے وصایا"

۱۳۔ "تذکرۂ صادقہ"

۱۴۔ "ابقاء المنن"

۱۵۔ "ہمارے ہندی مسلمان"

۱۶۔ "کتاب ال[illegible]" عبدالجلیل

۱۷۔ "مشاہدات کابل و یاغستان"

۱۸۔ "تبلیغ رسالت" میر قاسم علی